

زخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 1

اپنے پیچھے کسی تیز رفتار گاڑی کی آواز سن کر وہ ایک دم سڑک سے نیچے اتر گئے۔ اسی وقت ایک جیپ بلا کی رفتار سے ان کے پاس سے گزر گئی:

”عجیب احمق ہے... اس قدر تیز گاڑی تو وہ شخص بھی نہیں چلاتا ہوگا جس کے پیچھے موت لگی ہو، کیونکہ اتنی تیز رفتاری بھی تو موت کے منہ میں ڈال سکتی ہے۔“ محمود نے نڈا سا منہ بتایا۔

”ہو سکتا ہے، اس کے پیچھے موت ہی لگی ہو۔“

فرزانہ نے خیال ظاہر

کیا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اس کے پیچھے اس وقت سوائے ہمارے اور کوئی بھی نہیں ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”خیر! ہم تو موت نہیں ہو سکتے۔“ محمود بولا۔

اچانک انھوں نے جیپ کو لڑکھڑا کر رکھتے دیکھا۔ ساتھ ہی دھماکا ہوا تھا۔

”لو بھئی، جیپ کا تو پھٹ گیا نا، اب یہ بے چارہ کیا کرے گا؟“ فرزانہ بولی۔

”آؤ پوچھ لیتے ہیں، اب کیا ارادہ ہے... اس قدر تیز کس طرح جاؤ گے۔“ فاروق نے کہا۔

فرزانہ نے اسے گھورا اور پھر منہ بنا کر سامنے دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھک سے رو گئے... جیپ میں سے خون میں تر ہر ایک آدمی نکل کر جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا، وہ بری طرح لنگڑا رہا تھا... شاید اس کی ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔

”یہ... یہ تو بہت زخمی ہے۔“ محمود بوکھلا اٹھا۔

”ہاں... آؤ... شاید اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔“

”اسے کہتے ہیں، آئیل مجھے مار۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

محمود اور فرزانہ تیزی سے جنگل میں گھس گئے... فاروق کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا... اُدھر زخمی بلا کی رفتار سے جنگل میں دوڑا جا رہا تھا، لیکن شاید اس کا ستارہ گردش میں تھا، اچانک وہ ایک درخت سے ٹکرا گیا... اس نے بچنے کی بہت

کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا... گرنے کے بعد وہ نہ اٹھ سکا۔

اتنے میں وہ اس کے نزدیک پہنچ گئے۔۔۔ اب وہ آوندھے منہ پڑا تھا:

”ہیلو... ارے، بھئی تم کون ہو اور یہاں آ کر آوندھے منہ کیوں لیٹ گئے ہو۔“ فاروق اس پر جھٹکا ہوا بولا۔

اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی... اب انہوں نے مل کر اسے سیدھا کیا:

”اوہو ایہ تو بے ہوش ہو گیا ہے۔“ محمود چونکا۔

”ہاں! کچھ تو پہلے ہی بہت زخمی تھا، کچھ درخت سے ٹکرا گیا، خون بہت بہہ چکا ہے، بے ہوش نہیں ہوگا تو کیا کرے گا۔“ فرزانہ جلدی جلدی ہوئی۔

”اب کیا کیا جائے؟“

”کرنا کیا ہے، اسے ہسپتال تک پہنچانا پڑے گا۔“

”لیکن کیسے... ہم تو بیدل ہیں، اس کی جیب کھینچ کر دیکھیں۔“ ہم اسے کس طرح لے جاسکتے ہیں۔“

”اس طرح کہ ہم اس کے پاس ٹھہرے گا۔۔۔ باقی دو شہری حدود میں پہنچ کر ہسپتال والوں کو فون کرائیں گے۔“

”بالکل ٹھیک... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”تو پھر میں یہاں ٹھہرتا ہوں، تم دونوں فون کراؤ۔“ محمود نے کہا۔

”تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟“ فاروق نے گھبرا کر پوچھا ”میں بزدل نہیں ہوں۔“ محمود مسکرایا۔

فاروق اور فرزانہ نے ابھی اپنا رخ سڑک کی طرف کیا ہی تھا کہ ایک لمبی سی نیلے رنگ کی کار آندھی اور طوفان کی طرح جیب کے پیچھے آ کر رُکی، کسی نے صبح کر کہا:

”یہ رہی اس کی جیب... وہ یہیں کہیں ہوگا... بہت زخمی ہے، زیادہ دور نہیں جاسکتا... تلاش کرو اور جہاں بھی نظر آئے ٹھکانے لگا دو۔“

وہ بوکھلا اٹھے... بہت سنسنی خیز حکم تھا... زخموں سے چور ایک آدمی کو جان سے مار ڈالنے کا حکم دیا گیا تھا... اور وہ زخمی ان کے پیروں کے پاس پڑا تھا، انھیں یوں لگا جیسے وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی ان سے کہہ رہا ہو:

”کیا تم مجھے ان درندوں سے نہیں بچاؤ گے؟“

”جلدی کرو... اسے اٹھا کر دوسری طرف لے چلو... وہ خون کے دھبوں کو دیکھ کر سیدھے اس طرف آئیں گے اور اس کا خاتمہ کر دیں گے... وہ نہ جانے کتنے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار کتنے ہیں۔“

”ہوں، لیکن ہم اسے زیادہ دور تک تو لے جائیں سکیں گے۔“ فرزانہ ہوئی۔

”کچھ بھی ہو... جہاں تک ممکن ہے، لے جانا ہوگا۔“

تینوں نے بے ہوش زخمی کو اٹھایا اور مخالف سمت میں لے چلے۔ زخمی کافی وزنی آدمی تھا۔ اسے اٹھا کر لے جانا ان کے لیے آسان کام نہیں تھا، لیکن دوسری طرف اس کی زندگی کا مسئلہ تھا، کچھ لوگ اسے موت کے گھاٹ اتار دینے پر تلے ہوئے تھے، جب وہ بری طرح ہاپنے لگے تو اسے زمین پر لٹا دیا۔ فاروق نے ہاپتے ہوئے دہی آواز میں کہا:

”بس اب اس سے آگے نہیں لے جایا جاتا۔“

”یہ بھی بہت ہے، ہم اسے کافی دور لے آئے ہیں، جب کہ اس کے دشمن خون کے نشانات کی سیدھ میں آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔“ محمود نے کہا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ مشکل یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ فرزانہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ مومن ہے تو بے قلع بھی لڑتا ہے، اگر لڑنے کا موقع آچا تو ہم لڑیں گے بھی۔۔۔ اس بے ہوش زخمی کو قتل ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔“

اسی وقت انھوں نے جنگل میں قدموں کی آواز سنی۔۔۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔۔۔ انھوں نے کافی دور چلتے سات آدمیوں کو اس طرف جاتے دیکھا، جس طرف سے زخمی گزرا تھا۔

”کیوں نہ ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر سڑک پر پہنچ جائیں اور۔۔۔“ محمود کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا۔۔۔ تم کہتے کہتے رک کیوں جاتے ہو؟“ فرزانہ بے تابانہ بولی۔

”اور یہ کہ وہاں ان لوگوں کی نیلی کار موجود ہے، ہم اس کار پر اس زخمی کو سوار کر کے بھاگ نکلیں۔“ محمود مسکرایا۔

”اول تو زخمی کو کار تک لے جانا آسان کام نہیں، دوسرے یہ کہ اگر لے بھی جائیں تو کار کے پاس بھی تو ان کا کوئی ساتھی موجود ہوگا۔۔۔ اس کا ہم کیا کریں گے۔“ فاروق نے اعتراض کیا۔

”میں بتاتا ہوں۔۔۔ ہم کسی چیز سے اس کے سر کا نشانہ لے سکتے ہیں۔“

”ہوں، بات ٹھیک ہے۔۔۔ غور کیا جاسکتا ہے۔۔۔ سنو۔۔۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔۔۔ یہ کہ ہم زخمی کو اٹھا کر سڑک کے کنارے تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر کار پر قبضہ کرنے کی کوشش شروع کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، ان حالات میں ہم اس کے سوا کچھ ہی کیا سکتے ہیں۔“ فرزانہ نے گویا منظوری دی۔

”ان حالات میں ہی کیا، ہم تو ہر قسم کے حالات میں ہی کچھ کر پاتے ہیں۔“ فاروق جھلا اٹھا۔

”آخر تم اس قدر جھنجھلا کیوں رہے ہو؟“

”اس لیے کہ نکلے تھے شہر سے باہر کی سیر کرنے۔۔۔ یہ سیر ہو رہی ہے۔“

”بھئی سیر نے ہمیں ایک عدد چکر میں الجھا دیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔۔۔ اور پھر اگر معاملہ ایسا ویسا ہوتا تو ہم دخل

انداز میں نہ کرتے۔۔۔ یہاں معاملہ ہے ایک شخص کی زندگی کا جو پہلے ہی بہت زخمی ہے۔۔۔ آخر اس غریب زخمی کو ان لوگوں کو مارنے کی ایسی کیا خاص ضرورت پیش آگئی ہے۔۔۔ ہے کوئی ٹک۔۔۔" محمود جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"اچھا بھئی۔۔۔ نہیں ہوگی ٹک۔۔۔ چلو اٹھاؤ اسے۔"

تینوں نے مل کر پھر اسے اٹھایا اور چکروں کے سرک کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔ پانچ منٹ تک چلنے کے بعد ہی انھیں سرک پر نیلی کار دکھائی دی گئی اور یہ دیکھ کر تو ان کی سٹی گم ہو گئی کہ کار سے ایک آدمی لگا کھڑا تھا اور اس کی نظریں جنگل میں گڑی ہوئی تھیں۔۔۔ اس کے ساتھ ہی جس طرف گئے تھے، وہ اسی سمت میں دیکھ رہا تھا۔ (جاری ہے)

زخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 2

”اس کی توجہ ہماری سمت میں بالکل بھی نہیں ہے۔ لہذا ہم سڑک کے عین نزدیک پہنچ سکتے ہیں۔“

”لیکن سوال تو کار پر قبضہ کرنے کا ہے۔۔۔ اور ہم اس کے ہاتھ میں ایک عدد پستول بھی دیکھ رہے ہیں۔“ قاروق

یولا۔

”تو کیا ہوا۔۔۔ ہم قدرتی

اتھلیاروں سے کام لینے کے عادی ہیں۔“ فرزانہ

مسکرائی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے زمین پر پڑا ایک پتھر اٹھالیا۔ یہ سیب بنتا ہوا تھا:

”تم لوگ بھی ایک ایک پتھر اٹھاؤ۔۔۔ پتھروں کی یہاں کمی نہیں۔۔۔ سیکڑوں کھرے پڑے ہیں، ہم ایک ساتھ تین

پتھر اس پر دے ماریں گے۔۔۔ کوئی ایک بھی اس کے سر پر بیٹھ گیا تو ہم کامیاب رہیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”ٹھیک

ہے۔“

زخمی کو انھوں نے ایک درخت کی اوٹ میں لٹا دیا۔۔۔ اس نے ابھی تک ایک بار بھی آنکھ نہیں کھولی تھی۔۔۔ اب وہ کار

والے کے اور نزدیک ہونے لگے اور جب اس حد تک پہنچ گئے کہ پتھر نشانے پر لگ سکیں تو رُک گئے۔۔۔ تینوں نے ایک

ساتھ نشانہ لیا اور پتھر پھینک مارے۔۔۔ تینوں کے تینوں پتھر ایک ساتھ اس کے سر پر لگے۔۔۔ اس کے طلق سے آواز نکلا۔

کھل سکی۔۔۔ گرتا چلا گیا:

”دیر ہی گزشتہ۔۔۔ حرا آ گیا۔“ قاروق چپکا، لیکن آواز نیچی تھی۔

اب تینوں سینے کے بل رینگ کر اس کے پاس پہنچے۔۔۔ محمود نے سب سے پہلے پستول اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔۔۔

وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔۔۔ کار کا ایک دروازہ کھلا تھا۔۔۔ چابی بھی لگی ہوئی تھی۔۔۔ یہ دیکھ کر ان کی باجھیں کھل

گئیں۔۔۔ کامیابی ان کے قدم چومنے کے لیے تیار تھی۔۔۔ محمود نے کار کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا۔۔۔ اب تینوں زخمی

کے پاس آئے، اسے اٹھایا اور کار کی طرف چلے، ابھی اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا ہی تھا کہ جنگل کی طرف سے آواز

آبھری:

”سر۔۔۔ خون کے نشانات ایک جگہ رُک گئے ہیں، سامنے اور دائیں بائیں کوئی نشان نظر نہیں آ رہا، اب کیا کریں۔“

وہ ساکت رہ گئے۔۔۔ جواب دینے والا تو بے ہوش پڑا تھا۔

”کاش۔۔۔ اس نے یہ سوال ہمارے پتھر مارنے سے پہلے پوچھا ہوتا۔“

”محمود! اب دیر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں، اب ہمارے پاس ایک عدد ہسپتال بھی ہے۔“ فرزانہ بولی۔  
 ”لیکن فرزانہ... ہمیں کار بیک کرنا ہوگی اور اتنی دیر میں وہ سڑک پر پہنچ جائیں گے۔“ محمود نے اعتراض کیا۔  
 ”اوہ! یہ بھی ٹھیک ہے... کار بیک کرنا خطرناک ہوگا... بس سیدھے ہی نکل چلو۔“  
 ”سر... آپ نے جواب نہیں دیا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔  
 ”آؤ... اب یہ لوگ سڑک کی طرف دوڑنے ہی والے ہیں۔“

تینوں کار میں بیٹھ گئے، انہوں نے دروازے بھی پورے بند نہ کیے، کیونکہ اس طرح آواز پیدا ہوتی اور پھر محمود نے  
 انجن چلا دیا۔ دوسرے ہی لمحے کار آگے بڑھی۔  
 ”ارے ارے... سر... یہ کیا... اوہ شاید آپ نے اسے اس طرف کہیں دیکھ لیا ہے... فکر نہ کریں، ہم بھی آرہے  
 ہیں۔“

وہ جنگل میں ہی آگے کی طرف دوڑ پڑے... محمود نے رفتار بڑھادی اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔  
 ”لو بھئی... ان کے چنگل سے تو نکل آئے... اب کیا کریں؟“ محمود خوش ہو کر بولا۔  
 ”مشکل یہ ہے کہ یہ سڑک دوسرے شہر تک لے جاتی ہے... اس میں سے کوئی اور سڑک نہیں نکلتی جس پر مڑ کر ہم شہر  
 پہنچ سکیں۔“

”مناسب یہی ہے کہ ہم دوسرے شہر پہنچ کر وہیں ہسپتال میں اسے داخل کرادیں اور کسی اور گاڑی کے ذریعے شہر کی  
 طرف لوٹیں... حملہ آور ہمیں نہیں دیکھ سکے، اس طرح ہم کوئی خطرہ مول لیے بغیر اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔“ فرزانہ نے  
 ترکیب بتائی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ محمود بولا۔

”تمہارا تو ہمیشہ ہی وہی خیال ہوتا ہے جو فرزانہ کا ہوتا ہے، لیکن شاید تم دونوں نے یہ نہیں سوچا کہ شاہ پور یہاں سے  
 صرف پینتالیس کلومیٹر دور ہے... وہاں پہنچنے میں پینتالیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے، پھر زخمی کو ہسپتال میں داخل کرانا  
 ہوگا... اس میں بھی کچھ وقت لگے گا... اس کے بعد ہم واپسی کا رخ کریں گے، گویا اس میں بھی کچھ وقت لگے گا... تو کیا  
 ابا جان اور امی جان فکر مند نہیں ہو جائیں گے۔“ فاروق نے جملے بھنے لہجے میں کہا۔

”بے شک ہو جائیں گے، لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں، دوسرے تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ شاہ پور پہنچ کر ہم گھر  
 فون بھی تو کر سکتے ہیں۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”اوہ ہاں... یہ ٹھیک رہے گا۔“ فاروق جلدی سے بولا۔

آخر وہ شاہ پور پہنچے... شہر میں داخل ہونے کے بعد جو پہلا ہسپتال نظر آیا، وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا۔

”کیا خیال ہے... سرکاری ہسپتال میں داخل کرانے میں اور وقت ضائع ہوگا... اسے یہیں کیوں نہ داخل کر دیں۔“

”اور اخراجات کا کیا ہوگا۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

”بھئی ہم اسے غریب بھی نہیں ہیں کہ اس کا ہسپتال کا مل بندے نکلیں۔“ فرزانہ بھنا کر بولی۔

رُخمی کو ہسپتال میں داخل کرانے میں انھیں چند روٹ لگ گئے... انھیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا... اور بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب رُخمی کی حالت کا جائزہ لے کر انھیں جانے کی اجازت دیں گے، آخر میں منٹ بعد کہیں جا کر ڈاکٹر صاحب کی صورت دکھائی دی: ”اس مریض کو آپ لوگ لائے ہیں؟“

”جی ہاں... بالکل! اس میں کوئی شک نہیں۔“ فاروق نے فوراً کہا۔

”کہاں سے لائے ہیں؟“ ”جنگل میں بے ہوش پڑا تھا... ہم اٹھا لائے۔“

”ہوں! آپ کو پولیس کی موجودگی میں اپنا بیان لکھوانا پڑے گا، دوسرے یہ کہ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال ہے، اخراجات کا کیا ہوگا۔“

”وہ ہم خود ادا کریں گے، اس کے ہوش میں آنے پر ہی اس کے ہارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا، آیا یہ اخراجات ادا کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں... ہوگا تو آپ اس سے وصول کر لیں گے۔“

”ہوں ٹھیک ہے... میں انسپکٹر صاحب کو فون کر چکا ہوں... وہ آتے ہی ہوں گے۔“

”آخر پولیس کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اس قسم کا رُخمی ہم پولیس کو اطلاع دیے بغیر ہسپتال میں داخل نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر صاحب بولے۔

”کس قسم کا... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ فرزانہ الجھ کر بولی۔

”اس مریض کے جسم میں تقریباً نو گولیاں موجود ہیں، لیکن سب کی سب ایسی جگہ لگی ہیں کہ موت فوری واقع نہیں ہو سکتی تھی، تاہم اگر اسے خون نہ دیا گیا تو فحشاء و اب بھی نہیں سکے گا۔“ ”کیا کہنا... نو گولیاں۔“ محمود چلا اٹھا۔

”وہ دھک سے رہ گئے... اسی وقت انھوں نے ایک پولیس انسپکٹر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ (جاری ہے)

زخمی

اشتقاق احمد

قسط نمبر 3

انسپکٹر جمشید گھر جانے کے لیے اٹھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی... انھوں نے ریسیور اٹھایا اور بولے:

”ہیلو... کون صاحب؟“

”جمشید... فوراً میرے پاس آؤ۔“ دوسری طرف سے گھبرائے ہوئے انداز میں آئی جی شیخ شامی نے کہا۔

”بہت مبہتر سر!“ انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ کر باہر کی طرف لپکے۔

”خیر تو ہے سر!“ اکرام نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہاں نہیں... شیخ صاحب نے بلایا ہے۔“

وہ شیخ صاحب کے دفتر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ انھیں اور خان صاحب کو کار میں بیٹھے پایا:

”جلدی سے بیٹھ جاؤ جمشید۔“

”یا آئی خیر۔“ انھوں نے کہا اور بیٹھ گئے۔ کار فوراً چل پڑی۔

”خیر تو ہے سر؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا... وہاں پہنچی کر ہی بتا چلے گا۔“

”کہاں۔“ وہ بولے۔

”اس معاملے کو مکمل طور پر راز میں رکھا جا رہا ہے جمشید... چند دنوں سے صدر مملکت کی طبیعت بہت خراب تھی...“

ڈاکٹر صاحبان نے انھیں ایک بڑے فضا مقام پر جانے کا مشورہ دیا... وہ اپنی ذاتی رہائش گاہ پر چلے گئے جو دارالحکومت سے

نزدیک ہی ہے... ان کے ڈاکٹر اور ہاؤس گارڈ بھی ساتھ گئے تھے... ابھی ابھی وہاں سے فون موصول ہوا ہے کہ صدر

صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔“

”جی جی!“ انسپکٹر جمشید بھونچکے رہ گئے۔

”ہاں جمشید... تفصیلات فون پر نہیں بتائی گئیں... ہمیں وہاں پہنچی کر ہی معلوم ہو سکے گا... بہر حال انھوں نے خاص

طور پر تمہیں بلایا ہے۔“ آئی جی صاحب بولے۔

”اللہ اپنا رحم فرمائے... یہ ضرور کسی سازش کا نتیجہ ہے۔“

”ہاں اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے... ملک کے حالات آج کل یوں بھی بہت خراب ہیں، ملک دشمن عناصر نے

سراٹھار رکھا ہے، ان کا سر کچلنا ضروری ہے... اور صدر صاحب نے گزشتہ چند ماہ سے اس طرف خاص توجہ دینا شروع کر



رکھی تھی، لیکن پھر اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔۔۔ اور انھیں ذاتی رہائش گاہ جانا پڑا۔۔۔ گویا ایک طرح سے ملک دشمن عناصر کے خلاف مہم درمیان میں رہ گئی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کیا یہ حملہ اسی سلسلے میں کیا گیا ہے۔“

”کم از کم ہمارا خیال یہی ہے۔۔۔ باقی حالات وہاں جا کر ہی سامنے آئیں گے۔“

”ہوں۔“ وہ بولے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ رہائش گاہ میں داخل ہوئے۔۔۔ ہاڈی گارڈوں نے انھیں صدر صاحب تک پہنچایا، وہاں ڈاکٹروں کی پوری ٹیم موجود تھی اور صدر صاحب کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی۔

”آف خدا۔۔۔ یہ کیا ہوا؟“ آئی جی بولے۔

”آئیے۔۔۔ آئیے۔۔۔ لکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔۔۔ میں بال بال بچا ہوں۔۔۔ گولی میری پیشانی کو چھوتی ہوئی گزر گئی، اندر نہیں گھس سکی۔۔۔ میں اس وقت باغیچے میں ٹہل رہا تھا، جب حملہ کیا گیا۔۔۔ اتفاق سے اس وقت کوئی ہاڈی گارڈ بھی میرے آس پاس موجود نہیں تھا۔۔۔ بس اچانک فائر ہوا اور میں گر پڑا۔۔۔ میں حملہ آور کو بھی نہ دیکھ سکا۔۔۔ ہاڈی گارڈ گولی کی آواز سن کر دوڑے۔۔۔ لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی حملہ آور نہ جانے کہاں کا کہاں جا چکا تھا، مطلب یہ کہ اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکا۔“

”تو کیا دوڑتے قدموں کی آواز بھی نہیں سنی گئی؟“ انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

”ہاں ضرور۔۔۔ دوڑتے قدموں کی آواز میں نے گولی چٹنے کے فوراً بعد سنی تھی اور اس کے چند لمحوں بعد ہاڈی گارڈوں کے قدموں کی آواز سنی گئی۔۔۔ میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔۔۔ زخم ہی معمولی سا آیا تھا۔۔۔ لہذا قدموں کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔“ انھوں نے کہا۔

”تو کیا آپ یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے حملہ آور کے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔“

”ہاں بالکل۔“ انھوں نے کہا۔

”میرا مطلب یہ ہے سر۔۔۔ کہیں آپ نے پہلے جو آواز سنی، وہ بھی ہاڈی گارڈوں کی نہ ہو۔“

”نہیں۔۔۔ ایک آدمی کے دوڑنے کی آواز اور ہوتی ہے اور کئی آدمیوں کے دوڑنے کی اور۔۔۔ ہاڈی گارڈ سب ایک ساتھ دوڑ پڑے تھے۔“

”لیکن وہ آپ کے آس پاس کیوں نہیں تھے؟“ انھوں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں کم از کم چلتے وقت ہاڈی گارڈوں کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”ہوں اور اصل میں یہ سوچ رہا تھا۔۔۔ کہیں حملہ آور اندر کا ہی تو کوئی آدمی نہیں تھا اور اسے سرے سے بھاگنے کی

ضرورت ہی نہیں تھی۔“

”خمس... یعنی... ایسی کوئی بات نہیں... حملہ آور باڈی گارڈوں کے دوڑ پڑنے سے پہلے ہی بھاگ نکلا تھا۔“

”خیر... میں اس سلسلے میں تفتیش شروع کر دیتا ہوں... سب سے پہلے میں اس جگہ کا معائنہ کروں گا جس جگہ آپ ٹہل رہے تھے اور جس سمت سے گولی آئی تھی۔“

”جو جو... انسپکٹر صاحب کو ساتھ لے جاؤ۔“ صدر صاحب نے اپنے پیروں کی طرف کھڑے ایک باڈی گارڈ سے کہا۔

”اوکے سِر!“

وہ ہائیچے میں پہنچے... آئی جی صاحبان صدر صاحب کے پاس ہی بیٹھے رہے... ہائیچے کے عین درمیان میں پہنچ کر جو جو نے کہا:

”صدر صاحب اس جگہ ٹہل رہے تھے اور گولی اس طرف سے آئی تھی۔“

انھوں نے ہائیچے کا جائزہ لیا... چار دیواری کافی اونچی تھی... جس طرف جو جو نے اشارہ کیا، وہاں چار دیواری کے ساتھ ساتھ بلند دھالا درخت تھے۔

”اور آپ لوگ کہاں تھے؟“

”ہائیچے سے باہر، ٹہلتے وقت صدر صاحب کسی کی موجودگی برداشت نہیں کرتے۔“

”تو کیا، اس چار دیواری کے باہر پہرہ نہیں تھا۔“

”جی ہاں... بالکل تھا۔“

”تب پھر کوئی شخص چار دیواری پر کیونکر چڑھ گیا، نہ صرف چڑھ گیا... بلکہ اس نے ایک فائر بھی کیا اور فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا۔“

”اس کا جواب یہ ہے... دیوار کے دوسری طرف جو پہرے دار موجود تھا... وہ بے ہوش ملا ہے۔“

”کیا کہا... بے ہوش ملا ہے۔“

”جی ہاں! اسی جگہ سے وہ چار دیواری پر پہنچا... فائر کیا اور نیچے کود کر فرار ہو گیا۔“

”لیکن اس نے نیچے کھڑے پہرے دار کو بے ہوش کس طرح کیا؟“ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔ ”یہ پوری رہائش گاہ گھنے درختوں کے درمیان گھری ہے... کوئی شخص درختوں کی اوٹ لیتا ہوا چار دیواری تک پہنچا تھا اور ایک درخت کے ذریعے دیوار پر پہنچا... فائر کیا اور اوپر سے ہی چھلانگ لگا دی اور غائب ہو گیا... غائب ہونے کے لیے بھی

اس نے انھی درختوں کا سہارا لیا۔“

”ہوں اب میں سمجھ گیا، لیکن پھر یہ بات رہ گئی کہ اس نے پہرے دار کو بے ہوش کس طرح کیا؟“

”ایک بڑے سے پتھر کے ذریعے پہرے دار کے سر پر وہ پتھر لگا اور وہ آوار پیدا کیے بغیر ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔“  
”ہوں! میں اس سے متاچا بتا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”ضرور آئیے ایک ڈاکٹر اس کی بھی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔“

ہاڈی گارڈ انھیں لے کر ایک کمرے تک آیا۔ دروازے پر بھی ایک ہاڈی گارڈ تعینات تھا۔

”کرم خان کا کیا حال ہے؟“

”ہوش میں آچکا ہے۔“

”ہوں۔“ ”جئے جناب۔“

وہ اس کے ساتھ عذر داخل ہوئے۔ ایک بستر پر اکرم خان بیٹا تھا، اس کے سر پر بھی پٹی بندھی تھی۔ اس کے سرہانے کی طرف کرسی پر ایک ڈاکٹر بیٹھا تھا۔

”کرم خان۔ یہ انسپکٹر جمشید ہیں، تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔“

”جی فرمائیے۔“

”کیا آپ حملہ آور کو دیکھ سکے تھے؟“

”جے ہوش ہوتے ہوتے میں نے اس کی ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔“ (جاری ہے)

”بہت خوب اس کا حید کیا تھا؟“

”لبا چوڑا لندہ سڈول جسم، در سرخ و سفید رنگ، بس میں اسی قدر دیکھ سکا تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔“

”تو اس نے پتھر آپ کے سر پر مارا تھا۔“

”ہاں، مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ کب پتھر آیا اور کب لگا۔“

”حیرت ہے اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا، اگر نشانہ چوک جاتا تو وہ مارا گیا تھا نا۔“

”شاید وہ کوئی بہت ماہر نشانہ ہار تھا، ورنہ اسے اپنے نشانے پر زبردست اعتماد ہوگا۔“ اکرم خاں نے کہا۔

”ہاں، ایسی بات معلوم ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف مڑے

”ان کے زخم کی کیا کیفیت ہے جناب؟“

”زیادہ گہرا نہیں ہے، در خطر ناک بھی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اور وہ پتھر کہاں سے جو مارا گیا۔“

”وہ اس طرف رکھا ہے، ایک ٹرے میں۔“ جو جو نے ان کی توجہ کمرے کے ایک کونے کی طرف دلائی، وہاں

ایک چھوٹی سی میز پر ایک ٹرے رکھی تھی، ٹرے میں ایک پتھر موجود تھا، بڑے سائز کے آم جتنا بڑا، جو نوک دار بھی

تھا۔۔ اس پر خون بھی لگا ہوا تھا:

”کیا اس پتھر کا نوک دار حصہ اکرم خان کے سر پر لگا ہے؟“ انھوں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”جی نہیں، پچھلے حصہ۔“

”شکریہ جناب، مجھے بس یہی سوالات کرنے تھے، اب میں چلوں گا، آئیے مسٹر جو جو۔“

وہ پھر صدر صاحب والے کمرے میں آئے

”کیوں حشید، کچھ معلوم ہوا؟“

”میں کوشش کر رہا ہوں سر، آپ مطمئن رہیں، احمد اور میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔“

”احمد آو، لیکن ہم حملہ آور کو گرفتار کر کے کیا کریں گے۔“ صدر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

”جی، کیا مطلب؟“ انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

”میں تو یہ چاہتا تھا ہوں کہ یہ سازش کس کی ہے؟“

”جی ہاں، بالکل ٹھیک۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں پہلے حملہ آور کو گرفتار کرنا ہوگا۔“

”خیر تم جانو تمہارا کام۔“

”اب میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔“

”ضرور کیوں نہیں۔ کیا آپ کو شک ہے کہ اپنے خلاف میں نے خود سازش کی ہے۔“ صدر صاحب مسکرائے۔

”ارے نہیں امیری تو یہ۔“ انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا، پھر سنجیدہ لہجے میں پوچھا

”کیا آپ کے یہاں آنے کا پروگرام چار تک طے ہوا تھا؟“

”ہاں“ چار تک ہی سمجھ لیں، کیونکہ طبیعت بھی اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔“

”کیا مطلب بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی؟“

”ہاں! بہت زیادہ۔“ معدے میں عجیب قسم کی گرائی محسوس ہونے لگی تھی، ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ میں یہاں

چھ آؤں۔“ انھوں نے بتایا۔

”گو یہ پہلے سے یہاں آنے کا پروگرام نہیں تھا۔“

”نہیں؟“

”تب پھر سازش بھی اچانک تیار کی گئی۔ اور حملہ بھی اچانک ہی کیا گیا۔ پہلے منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔“

”ہو سکتا ہے یہی بات ہو، لیکن سب باتوں سے بچنا ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

”سرا ہر قسم کی معلومات حاصل کرنا پڑتی ہیں اور پھر ان کے ذریعے سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ بہر حال آپ بے فکر

رہیں، میں اس سازش کی تہہ تک پہنچ کر رہوں گا۔“

”شکریہ“

جمشید، مجھے آپ سے یہی امید ہے۔“ انھوں نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے بھی چند سوالات کرنا چاہوں گا، لیکن یہاں نہیں۔ باہر چل کر۔“ انھوں نے ڈاکٹر

رحمانی سے کہا۔

”ضرور کیوں نہیں۔“ وہ آٹھ کھڑے ہوئے۔

دونوں باہر نکلے

”یہ معدے کی گرائی والا کیا معاملہ ہے؟“

”ان کے معدے میں تیز بیت بہت ہو گئی ہے۔“ ڈاکٹر رحمانی نے جواب دیا۔

”تو کیا اس کے علاج کے لیے یہاں لانا ضروری تھا؟“

”جی ہاں! بعض اوقات تیز بیت ذہنی پریشانوں کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ چند دنوں کے لیے انھیں ذہنی الجھنوں سے بھی نجات دل جائے۔ ایسا صدر میں رہتے ہوئے تو سمجھ نہیں چکا تھا۔“

”ہوں! آپ کا حیاں بھی ٹھیک ہے۔ اچھا یہ بتائیے۔ کسی شخص کے سر پر اگر پتھر مارا جائے۔ تو کیا اس پتھر پر خون لگ جاتا ہے۔ جب کہ پتھر صرف ایک بار مار گیا ہو۔“

”نہیں۔ خون تو چند لمحوں بعد ہی نکلتا ہے۔“ ڈاکٹر رحمانی بولے۔

”تب پھر جو پتھر اکرم خان کے سر پر مارا گیا۔ اس پر خون کیوں لگا ہوا ہے؟“

”اوہ!“ ڈاکٹر رحمانی کے منہ سے نکلا۔

وہ دھک سے رہ گئے۔ منہ کھل کا کھل رہ گیا۔

”اکرم خاں کو حراست میں لیا جانا بہت ضروری ہے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید س کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ جس میں اکرم خان بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر رحمانی بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ (جاری ہے)

رُخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 5

”یے انسپکٹر صاحب مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔“

”معلوم ہوتا ہے کوئی خاص معاملہ پیش آیا ہے۔“ پولیس انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! خاص ہی سمجھئے۔ پہلے تو آپ ن تینوں سے ملے اور اب تو خود میں نے بھی ابھی ن سے نہیں

پوچھے۔ ہاں ابھی اپنا تعارف خود ہی کر دیجئے۔“

”ضرور کیوں نہیں میں محمود ہوں، یہ فاروق اور فرزانہ ہیں۔“

”اور یہ انسپکٹر سجاد ہیں۔ اب میں عرض کرتا ہوں جناب۔ یہ تینوں

ایک رُخمی کو لائے ہیں، اس کے جسم میں نو گولیاں لگی ہیں۔“

”کیا کہا نو گولیاں۔ جب تو وہ مر گیا ہوگا تو یہ خود ہی اس کے قاتل ہیں، ابھی یہ تو بہت مزے کی بات ہوگئی۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! اس تو وہ ابھی مر نہیں، دوسرے یہ کہ سے ہم نے گویا نہیں ماریں، ہمیں تو وہ بے

ہوش حالت میں تھا، ہم اسے اٹھا کر یہاں سے آئے۔“

”ہر قاتل کی نئی باتیں بتاتا کرتا ہے۔ خیر میں دیکھوں گا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ہاں تو ڈاکٹر صاحب۔“ آپ کیا

کہتے ہیں۔“

”رُخمی کو خون کی بہت ضرورت ہے۔ پہلے تو مجھے خوں دینے کا بندوبست کرنا ہے۔“

”ہوں! تو میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ تھانے لے جاتا ہوں، وہیں ان کا بیویوں گا۔“

”جی بہتر۔“ ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

”وہ بھی چلیں۔“ انسپکٹر ن سے بولا۔

”بہتر ہوگا۔ پہلے آپ ساری بات سن لیں۔“ محمود نے تیز بچے میں کہا۔

”فلرز کرو۔ میں ساری بات سنوگا، لیکن یہاں نہیں۔ تھانے میں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ فاروق نے کندھے اچکائے۔

عین اسی وقت ایک کانسٹیبل اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر جوش کے آثار تھے۔

”کیا بات ہے کانسٹبل خان۔“

”ہم نے میدان مار لیا سر۔“ وہ مسرت سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”میدان مار لیا۔ اُنواہم یہاں میدان مارے نہیں، ڈاکٹر صاحب کے بلانے پر آئے تھے۔“ انسپکٹر سجاد نے منہ  
مٹایا۔

”آپ سمجھے نہیں سر؟“

”اچھا تو پھر تم سمجھ دو۔“ اس نے اور بھی تھلا کر کہا۔

”ہسپتال سے باہر نیلے رنگ کی جو کار کھڑی ہے، وہ اپنے ملک صاحب کی ہے، جس کی تلاش میں اس وقت  
سارے شہر کی پولیس ماری ماری پھر رہی ہے۔“

”کیا کہا۔ ملک صاحب کی کار؟“ انسپکٹر صاحب چلا اٹھے ورنہ باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ کانسٹیبل نے بھی اس کا  
ساتھ دیا۔

”اور کروٹنگی۔“ فاروق نے منہ مٹایا۔

”گھر میں ہمارا بہت بے چارے سے انتظار شروع ہو چکا ہوگا۔“

”اللہ ناک ہے۔“ فرزانہ بیڑائی۔

”ہاں اس میں کیا شک ہے، ناک تو وہی ہے۔“

”وہ پھر ہم بھی ہر چل کر دیکھیں۔ ملک صاحب کی کوئی سی کار ہے۔“

”کہیں یہ وہی کار نہ ہو۔ جس پر ہم رخمی کوئے کرتے ہیں۔“

”اگر ہو بھی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کار ہم لے نہیں، ان حد دروں لے چرائی ہوگی، جنہوں نے اس رخمی کو  
گوسیاں ماری ہیں۔“

”کیوں نہ ہم نکل

چلیں، موقع چھا ہے۔“ فاروق نے تجویز پیش کی۔

”نہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اب اس معاملے کو بھگت کر ہی جائیں گے۔“ فرزانہ نے لنگی میں سر ہلایا۔

آخر قیوں ہر نکل آئے ورنہ دیکھ کر چونک اٹھے کہ پولیس والے اسی کار کے گرد جمع تھے جس میں وہ آئے تھے۔  
انہوں نے سنا، انسپکٹر سجاد کانسٹیبلوں سے کہہ رہا تھا۔

”اندر جا کر معلوم کرو اس کار پر کون آیا ہے۔“

”اندر جانے کی ضرورت نہیں جناب۔ اس کار پر ہم آئے ہیں رخمی کو، نے کے لیے ہمیں اس کار کی ضرورت پڑی  
تھی۔“

”تو یہ کار تم نے چرائی تھی۔ اب تو تمہارا جرم اور بھی سنگین ہو گیا ہے۔“



”جی نہیں اسکی کوئی بات نہیں۔ آپ پھر غلط سمجھے۔۔۔ درست سمجھ بھی کس طرح کہتے ہیں۔ آپ بے ابھی حالات تو سننے ہی نہیں۔“ فاروق بے بڑا سامنے بٹایا۔

”کامل خان۔ ملک صاحب کو لون کر دو کہ ہم نے ان کی کار تلاش کر لی ہے۔“  
”جی بہتر اٹیں، ابھی لون کرنا ہوں۔“ یہ کہہ کر کامل خان غدر چڑ گیا۔ اسی وقت ڈاکٹر صاحب باہر آتے نظر آئے  
”بیچے ڈاکٹر صاحب یہ لوگ تو چھپے رستم لکھے۔ اپنے ملک صاحب کی کار انہوں نے ہی چرائی تھی۔“ انسپکٹر سجاد بول اٹھا۔

”ارے!“ ڈاکٹر صاحب دھک سے رو گئے۔  
”یہ غلط ہے۔ ہم نے کار نہیں چرائی۔ ہاں! ہم اس کے در پیچے رسمی کو مصروف رکھے ہیں، یہ کیوں ہوا؟ راہبان سن لیں، آپ کو مظلوم ہو جائے گا۔“

”تمہارا بیان بھی ضرور سن جائے گا، فکر نہ کرو، لیکن تم کچھ بھی بیاں دو، سچی نہیں کہتے۔ انسپکٹر سجاد نے تو بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے تم تو ہو کیا۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔“ انسپکٹر نے فخریہ نغاز میں کہا۔  
”اس میں کیا شک ہے جناب۔“

”اتنے میں کامل خان تا نظر آیا۔ اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔“  
”ملک صاحب نے ہمیں شاباش دی ہے جناب۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کی ترقی ہو کر رہے گی اور اس کی طرف سے جو انعام ملے گا، وہ انک رہا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمیں آ رہے ہیں۔“  
”یہیں آ رہے ہیں۔۔۔ بہت خوب ایہ اور بھی اچھی بات ہے۔“  
”یہ ملک صاحب کون واسطہ شریف ہیں جناب؟“ محمود نے پوچھا۔  
”ارے تم ملک صاحب کو بھی نہیں جانتے۔“  
”جی نہیں اس لیے کہ ہم تو سیدھے دارالحکومت سے چلے آ رہے ہیں۔“

”تو ملک صاحب بھی تو دارالحکومت کے رہنے والے ہیں۔ یہاں تو ان کی رہائی زمیں ہے اور تاج کل وہ یہیں آئے ہوئے ہیں۔“

”ان کا نام کیا ہے؟“ محمود حیرن ہو کر پوچھا۔  
”ملک دبیر۔“

وہ حیرن رہ گئے۔ ان دنوں ملک دبیر کی شہرت پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے، کئی طوں و درکار خانوں کا مالک ہے۔ بے تحاشہ زمین اور چاندی ادکا مالک ہے۔ اور اس کے تعلقات بڑے بڑے

لوگوں سے سننے میں آئے تھے۔ اور اس شخص کی کار میں وہ رنجی کو لے آئے تھے۔

”کیوں کیا ہوا۔ ملک دیکھ کر کام سن کر سٹانے میں کیوں آ گئے۔“ انسپکٹر سجاد ہنس۔

”سٹانے میں تو نہیں، ہاں ہمیں حیرت ضرور ہوئی ہے۔“ خزان کی کار میں وہ غنڈے کس طرح سوار تھے۔“  
”کون سے غنڈے۔“

”وہی۔ جنہوں نے اس شخص کو رنجی کیا ہے۔“

”اوپر دھڑکی نہ دھکو۔ ہم سچ گلوانا چاہتے ہیں۔“

”اور ہمیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔۔۔“ فرز نے منہ بنا کر کہا۔

”ملک صاحب کے آنے تک ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، اب جو کچھ ہوگا، خفی کے حکم سے ہوگا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔“ محمود تھلا اٹھا۔

جتنے میں ایک لمبی سی رورنگ کی کار ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ انسپکٹر سجاد پکارا اٹھے  
”ملک صاحب آ گئے۔“

تمام پولیس والے زرد کار کی طرف دوڑے۔ ڈکڑنے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس وقت ہسپتال کا جتن عمارت کے  
میں موجود تھا۔ وہ بھی سب کا سب زرد کار کی طرف دوڑ پڑا۔ بس وہ تینوں نیلی کار کے پاس کھڑے رہ گئے  
”یہ ملک صاحب ہیں یا ملک کے صدر صاحب۔“ محمود حیراں ہو کر بولا۔

”مجھے تو یہ صدر صاحب سے بھی اونچی چیز نظر آتے ہیں۔“

زرد کار کے دونوں طرف لوگ کھڑے ہو گئے، پھر ملک صاحب کے اراکین نے ان کے لیے کار کا دروازہ کھولا، وہ  
باہر نکل کر لوگوں کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتے ہوئے ان کے درمیان سے گزر کر نیلی کار کی طرف  
بڑھنے لگے۔ انسپکٹر سجاد پر جوش انداز میں کار دریاخت کرنے کی تحصیل بنا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ملک صاحب نیلی کار  
کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کی نظریں ان تینوں پر جم گئیں۔ باقی سب لوگ اب اس کے چاروں طرف جمع ہو  
چکے تھے۔

”تو کار انہوں نے چرائی تھی۔“

”اس وقت تک کے حالات تو یہی کہہ رہے ہیں۔“

”تو پھر انہیں فوری طور پر حوالت کی ساقوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔ ارے ہاں۔ میں نے کار کی تلاشی تو ہی نہیں  
اصلی پریشانی کار کی نہیں تھی۔ کار میں رکھے ہیروں اور جوہرات کی تھی اور یہ بات میں ابھی بار بار ہا ہوں۔ کار کی  
جوہری کی اطلاع دیتے وقت بھی میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔“

”اوہ!“ کئی خوف زدہ ہو کر نہریں ابھریں۔ انسپکٹر سجاد کا تو رنگ ہی اڑ گیا، شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے جوہرات غائب ہو گئے تو ترقی کا موقع خاک میں مل جائے گا۔“

ملک صاحب نے چابی کے ذریعے کار کا ایک حائل کھولا، ظاہر ہے، ان کے پاس دوسری چابی تھی۔ حائل کھل گیا انہوں نے خانے میں ہاتھ ڈال کر جوہرات کا بکس نکالا۔ بکس کھولتے ہی لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ (جاری ہے)

زخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 6

”ویری گنڈ، تمام چیزیں موجود ہیں، اس کا مطلب ہے، چور حضرت اس خانے کو نہیں کھول سکے۔ کھوس بھی کس طرح سکتے تھے، یہ خانہ تو میں نے خاص طور پر گلوایا ہے کار میں۔ انسپکٹر صاحب آپ کی ترقی پکی، آپ کے ماتحتوں کی بھی پکی۔ اہنا انعام کل کسی وقت کو بھی پر آ کرے لیجیے گا۔ وہاں یہ لوگ رہا نہ ہوئے پائیں۔ اس کی ضمانت کسی طرح بھی نہ ہو۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ ضمانت نہیں ہوسکے گی۔ جب تک کہ آپ نہ چاہیں گے۔“

”اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا۔“

یہ کہہ کر ملک صاحب زرد کار کی طرف مز گئے، پھر زک کر بولے

”میرا دوسرا ڈرائیور آ کر کار لے جائے گا۔“

”بے فکر رہیں سر۔ اب کار کہیں نہیں جائے گی۔“

”اچھا شکریہ“

ملک صاحب چلے گئے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور انسپکٹر سجاد ان کی طرف مڑا:

”چلو بھئی۔ منہ جو چپ میں، اتنی مہربانی میں تم پر کروں گا کہ میں سے اٹھکڑیاں پہنا کر نہیں لے جاؤں گا۔“

”بہتر ہوتا کہ آپ واقعات کی تفصیل میں سن لیتے، اس کے بعد شاید آپ ہمیں تھامے لے جانے کی ضرورت ہی

محسوس نہ کرتے۔“

”ب یہ نہیں ہو سکتا، ملک صاحب تم لوگوں کے بارے میں حکم دے چکے ہیں، حوالہ میں تو تمہیں رکھنا ہی ہو گا اور

وہاں سے جیل بھیجا جائے گا۔“

”چاہے ہم نے کوئی جرم نہ کیا ہو۔“ محمود حیران ہو کر بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں نے کوئی جرم نہ کیا ہو، تمہارا جرم تو ثابت ہے۔“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“ محمود تیز بچے میں بولا۔

”اس طرح کہ ملک دامیر کی کار تمہارے قبضے سے ہم نے برآمد کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک دامیر کا حکم یہ ہے کہ تم

لوگوں کو جیل بھجوا دیا جائے۔“

”تو یہ ہمارے مجرم ہونے کی دلیل ہے۔“

”ہاں بالکل۔“

”چھ جیسے آپ کی مرضی، ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ جو قدم بھی اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔“

”مجھے سوچنے اور سمجھنے کی کیا ضرورت ہے، میرے لیے تو سوچنے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ ملک دہمیر تم لوگوں کے ہمارے میں ہم

دے چکے ہیں۔“

انھیں جیب میں بیٹھنا پڑا پوس والوں سے ہاتھ پائی کرنا اس کا اصول نہیں تھا۔ آخر جیب تھانے میں داخل ہوئی اور انسپکٹر سجاد انھیں دفتر میں لے آیا

”اس طرف کھڑے ہو جاؤ اور اپنا بیان نکھو، آؤ تم میں سے صرف ایک بولے گا، دستخط تم تینوں کے کر، یہ جائیں گے۔ یاد رہے جو یہاں بھی تم نکھو رہے ہو، تم سے اس کے سلسلے میں کوئی ربر دیتی نہیں کی جارہی۔“ انسپکٹر سجاد نے جلدی جلدی کہا۔

”جی بہتر یاد رہے گی یہ بات۔“ فاروق نے مسہٹایا۔

حمود نے بیان شروع کیا اور جو کچھ گزری تھی، کہہ سنائی۔ محرر بیان نکلتا چلا گیا، انسپکٹر سجاد نے نوے منہ بتاتا رہا۔ اس کا بیان ختم ہونے پر ن کے دستخط لے لیے گئے، نیچے انسپکٹر سجاد نے اپنا بیان لکھا جس میں ملک دہمیر کی کار کا ذکر کیا گیا تھا اور اس کے بعد کاشیہیل سے کہا۔

”کامل خان، ان تینوں کو حوا، ت میں بند کر دو۔“

”کیا ہاں بیان سننے کے بعد بھی آپ ہمیں حوا، ت میں بند کریں گے۔ جب کہ ہم نے انسانی تقاضا پورا کیا ہے، اگر ہم اسے ڈھکی حالت میں چھوڑ کر اپنا راستہ لیتے تو اس وقت آپے گھر بیٹھے ہوتے اور وہ مرچکا ہوتا یا مار جا چکا ہوتا۔“ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے۔“ فاروق نے جے کئے لہجے میں کہا۔

”میں یہ سب کچھ ضرور سوچتا، اگر ملک صاحب کی کار تم لوگوں کے پاس سے نہ ملتی۔“

”ہم نکھو چکے ہیں۔ وہ کار بھروسوں کے قبضے میں تھی۔ ڈھکی کو ان کے پٹے سے پانے کے لیے ہمیں اس کار کو استعمال کرنا پڑا، یہ جرم کس طرف ہو گیا۔“

”اب اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی، مجھ سے بحث نہ کرو۔“ اس نے تھکا کر کہا۔

حمود، فاروق اور فرہ نہ کو بے تحاشہ غصہ رہا تھا، لیکن کر ہی کیا سکتے تھے۔ آخر فرزانہ نے کہا

”تو آپ ہمارے ساتھ جنگل میں چل کر موقعے کا معاملہ کیوں نہیں کر دیتے، اگر ہم جھوٹے ہوں گے تو جنگل میں

خون کے دھبے موجود نہیں ہوں گے۔“

”رات کے وقت کون وہاں جائے۔ صبح جا کر میں خود ہی دیکھ لوں گا۔“ اس نے کندھے اُچکائے۔

”چھ تو پھر ہمیں کسی وکیل کو فون کرنے کی اجازت دی جائے۔“

”اس وقت وکیل بھی نہیں ہے۔ صبح ہی فون کرنا ہے۔“

”گویا آپ ہمیں حالات میں بھیج کر رہیں گے۔ خیر آپ کی مرضی۔ آپ نے یہ خود ہی مشکلات پیدا کر رہے

ہیں۔ ہم یہ بتانے پر مجبور ہیں کہ ہم محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ انسپکٹر جمشید کے بچے۔“ محمود نے بلند آواز میں کہا۔

”کیا!!!“ انسپکٹر سہان پھل پڑا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

☆

دو دروازے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں اکرم خاں لینا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح لینا نظر آیا۔ ڈاکٹر

اس کے پاس کرسی پر اسی طرح بیٹھتے تھے۔

”خیر تو ہے سر!“ اس ڈاکٹر نے ٹھٹھے ہوئے کہا، اس کی نظریں ڈاکٹر رحمانی پر جمی تھیں۔

”پہ۔ پتھر۔“ ڈاکٹر رحمانی ہلکائے۔

”جی سر کیا فرمایا۔ پتھر۔“

”ہاں وہ پتھر کہاں ہے۔ جو اکرم خاں کے سر پر مار گیا تھا؟“

”وہ رہا۔ اس طرف، لیکن سر بات کیا ہے؟“

”ایک منٹ ٹھہریے۔“ انھوں نے کہا اور پتھر کی طرف بڑھ گئے، انسپکٹر جمشید تو پہلے ہی اس کے قریب جا کھڑے

ہوئے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب۔ سے ہاتھ نہ لگائیے گا۔ یہ دیکھیے۔ خون اس کے دھپکے دھپکے پر لگا ہوا ہے، لیکن آپ کا کہنا یہ ہے

کہ پتھر پر خون نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں! میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ پتھر لگتے ہی نیچے گرتا ہے، فوراً حوں نہیں لگتا، خون چند لمحوں بعد لگتا ہے۔“

”تب پھر ہم اس پتھر پر خون کیوں دیکھ رہے ہیں۔“

”یہ بات واقعی عجیب ہے اور میری سمجھ سے باہر بھی ہے۔“ ڈاکٹر رحمانی بوئے۔

”خیر آئیے۔“ یہ کہہ کر وہ اکرم خاں کی طرف نکلے۔

”ڈاکٹر صاحب۔ اکرم خاں کی پٹی آپ نے خود کی ہے؟“

”جی ہاں۔ بالکل۔“ دوسرا ڈاکٹر بور۔

”زخم ریا دو گہرائی میں نہ تھا۔ یہی بتایا تھا تا آپ نے۔“

”جی ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”کیا میں اس زخم کو دیکھ سکتا ہوں؟“ انھوں نے کہا۔

”جی۔ کیا مطلب؟“ ڈاکٹر نے چونک کر کہا۔

”مطلب یہ کہ اس کی پٹی کھول دیجیے۔ میں زخم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن کیوں۔ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے حیرت ہو کر کہا۔

”ڈاکٹر رحمانی صاحب آپ انھیں سمجھائیے۔“

”وہاں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر رحمانی آگے بڑھے۔

”ہاں یہ ہے ڈاکٹر صاحب، انسپکٹر صاحب کا خیال ہے۔ اکرم خان کے سر پر پتھر لگای نہیں۔“

”کیا کہا۔ پتھر لگای نہیں۔ اگر پتھر لگای نہیں تو پھر سر پر زخم کس طرح آ گیا۔“

”یہی تو ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جب پتھر اس کے سر پر نہیں لگا تو زخم کس طرح آ گیا۔“

”آپ کی دانتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں، بہر حال میں اپنی کھولے دیتا ہوں، لیکن اس طرح مریض کو تکلیف

ہوگی۔ اور یہ آخر صدر صاحب کے ہاڈی گارڈ ہیں۔“

”وہو ڈاکٹر رحمانی صاحب۔ یہ بات انسپکٹر جمشید صاحب کو بھی معلوم ہے۔ آپ پٹی کھول دیں۔“ ڈاکٹر

رحمانی نے ٹھک آ کر کہا۔

”جی بھتر! ڈاکٹر رحمانی نے کہا ورنہ نہ کر پٹی کھولنے لگا۔

اکرم خان ہوش میں تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ تاہم اس نے مد سے کچھ نہ کہا۔ آخر

پٹی کھل گئی اور زخم نظر آنے لگا۔ انسپکٹر جمشید زخم کے نزدیک ہو گئے اور بغور دیکھنے لگے۔

”زخم واقعی گہرا نہیں۔ پتھر اگر نوک در حصے کی طرف سے لگتا تو ضرور گہرا زخم آتا۔ مسٹر اکرم خان، کیا پتھر آپ

پر پھینک کر مارا گیا تھا۔“

”جی۔ جی ہاں۔ بالکل۔“

”شکریہ۔ میں آپ کو حراست میں لے رہا ہوں، اب آپ کو ملٹری ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو

نہیں۔“

”یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔“ اکرم خان بھونپکا رہ گیا۔

”انھوں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کی وجوہات دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ پتھر پر خون نہیں لگا ہوا ہونا چاہیے تھا،

دوسرے یہ کہ مگر پتھر پھینک کر مار گیا تھا تو پھر اسے نوکیلے حصے کی طرف سے سر پر لگنا چاہیے تھا۔ پھینکے جاے کی صورت میں پتھر وزنی سمت سے نہیں لگ سکتا تھا۔ ہم جب بھی ایک چاقو کو پھینک کر کسی دروازے پر مارتے ہیں تو چاقو ہمیشہ نوک کی طرف سے لگتا ہے۔ اس لیے کہ نوک دار حصہ ہلکا ہوتا ہے اور اس کا پچھلا حصہ وزنی۔ گویا پتھر آپ کے سر پر پھینک کر نہیں مارا گیا، نزدیک سے مارا گیا۔ دوسرے یہ کہ پتھر مارنے کے بعد اس پر خون انگلی سے لگایا گیا، اس کے بعد آپ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ اور محمد آوراہا کام کرنے کے لیے چار دیواری پر چڑھ گیا، گویا اس سازش میں آپ برابر کے حصے دار ہیں۔ اب کیا خیال ہے۔“  
 ”نہیں نہیں۔ یہ غلط ہے۔“ کرم خات چلا، ٹھاہ۔

(جاری ہے)



زخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 7

”کیوں بھئی، قطعہ کس طرح کیا میں یہ پتھر دوبارہ تمہارے سر پر مار کر تجربہ کروں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔  
”نہن، نہیں۔“ وہ ہٹلایا۔

”اگر تم قرار کر لو اور سارشی کے ہارے میں جتنا کچھ جانتے ہو، سب کچھ صاف صاف بتا دو تو شاید تمہارے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ پتھر واقعی میرے سر پر پھینک کر مارا گیا تھا۔ خون اس پر میرے پے ہوش ہونے کے بعد لگا یا گیا ہوگا۔ مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔“

”یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پتھر پھینک کر مارا گیا ہو، لہذا میں آپ کو حراست میں لیتا ہوں۔ اور ہسپتال“ کر آپ کا بیان ظلم بند کروں گا۔۔۔ آئیے ڈاکٹر صاحب۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔ انسپکٹر جمشید نے پیسے اکرام کو فون کیا اور پھر صدر صاحب کے پاس آئے۔  
”سازش کا سراہا تمہارا کیا ہے سر، بہت جلد میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

”بہت خوب جمشید، ڈرامہ بھی تو سنیں، کیا سراہا تمہارا کیا ہے۔“

انھوں نے اکرم خان، پتھر اور زخم کی تفصیل سنائی تو وہ سب حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ بات میرے حلق سے نہیں تر رہی کہ کرم خاں بھی سازش میں شریک ہو سکتا ہے۔“

”اس بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے سر، اس لیے کہ سے ساتھ ملے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، کیونکہ اگر پتھر چوک جاتا تو سرا منصوبہ وہیں دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ لہذا انھوں نے یہ انتظام کیا کہ پتھر چوک ہی نہ سکے اور اکرم خان کو ساتھ لے لیا۔“

”ہوں! تب پھر اس سے اٹھوایا جائے۔“

”اب میں بھی کروں گا۔ کرم خاں کو ملٹری ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ تاکہ وہاں اس کی حفاظت بھی ہوتی رہے۔ ہو سکتا ہے سازش اسے قتل کرنے کی کوشش کریں۔“

”اوہ ہاں... یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

جلد ہی کرم وہاں پہنچ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے اسے ہدایات دیں، اس سسٹم میں انھیں اس کے ساتھ باہر آنا پڑا۔

”سر! گھر سے فون آیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ اب تک میرے نہیں لوٹے۔“

”اوہو! اچھا!“ ان کے منہ سے نکلے، پھر بولے

”خیر تم اکرم خاں کو تو بے کر چلو پہلے یہ کام ضروری ہے، میں بھی مٹری ہسپتال پہنچ رہی ہوں۔ کرم خاں کا بیان شپ بھی کیا جائے گا اور تحریر بھی۔ اس کے علاوہ اس کے دماغ پر آلات بھی فٹ کیے جائیں گے تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکے۔“

”جی بہتر!“

”میں ذرا“

یہاں کے ہائی لوگوں سے سوالات کر لوں۔“

یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف مڑ گئے۔ ان کے چہرے پر اب فکر مندی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ سوالات سے فارغ ہو کر وہ مٹری ہسپتال پہنچے۔ اکرام انھیں اس کمرے کے دروازے پر ملا، جس میں اکرم خاں کو رکھا گیا تھا۔

”کیوں بھی، کیا سب انتظامات مکمل ہو گئے؟“

”جی ہاں، بالکل۔“

”تو پھر ڈی۔“

دونوں اندر داخل ہوئے۔ کرم خاں پوری طرح ہوش میں تھا۔ آلات کا مٹن دیا دیا گیا اور غیر محسوس طور پر ان کا کام شروع ہو گیا۔ ایک منٹ تک انتظار کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے

”مسٹر اکرم خاں، اب ہم آپ کا باقاعدہ عیاں میں گے، سب کچھ مدت میں آپ کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ لہذا جو بیان دیں، سوچ سمجھ کر دیں، آپ کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ بالکل سچ کہہ دیں۔ میرا پہلا سوال ہے کیا آپ صدر صاحب پر حملے کی سازش میں شریک نہیں ہیں؟“

”نہیں۔۔ نہیں۔“ اس نے کہا۔

پھر غور کریں۔ کیا کسی نے آپ کو مجبور کیا تھا، لالچی دیا تھا۔ آخر سر پر جان بوجھ کر پتھر کھانا، آسمان کا منہ نہیں۔“

”جی، جی ہاں۔ یہ تو حیرت انگیز ہے۔“

”تب پھر پتھر کھانے کا کتنا معاوضہ آپ کو دیا گیا، یا دینے کا وعدہ کیا گیا۔“

”میں نے نہ کہا نا میں نے سازش میں حصہ نہیں لیا۔“

”جھوٹ بول کر تو آپ نقصان میں ہی رہیں گے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔ انھوں نے بے بسی سے دوسرے افراد کی طرف دیکھا، آراء سیٹ کرے والے ایک فرد نے مٹن دیا اور ساتھ ہی انھوں نے کرم خاں کا چہرہ سرخ ہوتے محسوس

کیا

”تو پھر آپ پر پھینک کر رہا گیا تھا۔“

”سن نہیں، نزدیک آکر رہا گیا تھا۔“

”تب پھر آپ نے پھر، رنے والے کو ایب کرنے کی اجازت کیوں دی؟“

”مم میں میں واقعی، لچ میں گیا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور باتیں کرنے لگا، پھر باتوں باتوں میں اس نے مجھے رلچ دینا شروع کیا اور۔“

”نہیں اکرم خان۔ آپ پھر کھڑے ہیں۔ یہ یہ معاملہ نہیں جو ساتھ ساتھ طے کیا گیا ہو، یہ معاملہ تو آپ سے پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا اور صاف ظاہر ہے، آپ کو کوئی لمبی رقم پیش کی گئی ہوگی۔ جس کے بدلے میں آپ کو کرنا صرف یہ تھا کہ ایک پھر سر پر کھانا تھا اور بے ہوش ہو جانا تھا، کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔“

”ہاں۔ یہی بات ہے۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

”شکریہ اکرم خان اب ہمیں صرف یہ بتا دیں کہ وہ شخص کون ہے جس نے آپ سے معاملہ طے کیا تھا اور آپ کو کتنی رقم دی گئی۔۔۔ وہ رقم اب کہاں ہے؟“

”مم میں مجھے نوٹوں کا ایک بریف کیس بھرا ہوا دیا گیا تھا۔ میں نے انھیں گنا کیس تھا، جوں کے توں گھر میں رکھ دیے تھے۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”بہت خوب اب آپ سچ بول رہے ہیں۔ ہاں تو وہ کون ہے؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ یعنی کہ وہ۔“

ن الفاظ کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ پھر بدن میں قہر قہری دوزخ نظر آئی و در گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”ارے یہ کیا ہو۔“ انسپلر جشید بوکھا اٹھے۔

”یہ مرچکا ہے جناب۔“ ایک ڈکنر نے کہا۔

”مل۔ لیکن کیسے؟“

”یہ تو دیکھنا پڑے گا۔“

”تو پھر فوری طور پر پتا چلائیے۔ یہ کس طرح مر گیا۔“ انھوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ اکرم خان بہت غصہ وقت پر مرا تھا۔ عین اس وقت جب وہ مجرم کا نام بتانے والا تھا۔

باہر نکل کر انھوں نے گھر کے بھر ڈاکل کیے۔ سلسلہ ملتے ہی بوے

”ہیو ہیو۔ وہ تینوں ابھی تک لوٹے یا نہیں۔“

”جی نہیں۔ میں بہت فکرمند ہوں۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو بیگم۔“ یہ کہہ کر انھوں نے ریسور رکھ دیا اور برآمدے میں بیٹھنے لگے۔ وہ پہلے یہ جانتا چاہتے تھے کہ اکرم خان کس طرح مرا۔ اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ انھیں گہری سائش کا احساس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ان کا دہس محمود، فاروق اور فرزانہ میں اُبھھا ہوا تھا۔ نہ جانے ان پر کیا ہونے لگا کہ وہ فون تک نہیں کر سکے۔

آخر آدھ گھنٹے بعد تین ڈاکٹر کمرے سے نکل کر ن کی طرف بڑھے

”موت کا سراغ لگا ہوا گیا جناب۔“

”دیری لگے۔ وہ کس طرح مرا؟“

”زہر ہے۔ اس کے جسم میں ایک زہر داخل کیا گیا تھا۔ اسی سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔“

”زہر کب داخل کیا گیا۔ کیا اسی وقت۔“ انسپٹر جمشید چوہانے۔

”جی نہیں۔ کچھ دیر پہلے۔ وہ زہر فوری اثر کرنے والا نہیں ہے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد اثر کرتا ہے۔“

”آدھ گھنٹے بعد۔ گویا زہر اس کے جسم میں آدھ گھنٹہ پہلے داخل کیا گیا۔ اس وقت تو وہ صدر صاحب کی رہائش گاہ میں ہی موجود تھا۔“ انھوں نے حیرت ہو کر کہا۔

”جی ہاں زہر وہیں اس کے جسم میں داخل کیا گیا۔“

”اوہ اوہ۔ ڈاکٹر بھٹی۔“ انھوں نے بوکھل کر کہا اور بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

ن کا اس زور زور سے دھڑکنے لگا۔ باہر نکلتے ہی وہ اپنی جیب میں بیٹھے اور بڑا کی رفتار سے صدر صاحب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ن کی پریشانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

(جاری ہے)

”یہ... یہ میں نے کیا سنا ہے؟“

”آپ نے بالکل درست سنا ہے۔ ہم محمود، فاروق اور فرزاد ہیں، میرے لیے گھر سے نکلے ہوئے تھے کہ پیچھے سے ایک جیپ آئی اور آگے نکل گئی، پھر اس کا بازو پھٹ گیا، اور اس میں سے ایک آدمی نکل کر جنگل میں گھس گیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کی مدد کرنے کے لیے ہم بھی اس کی طرف دوڑ پڑے۔ دوڑتے ہوئے وہ ایک درخت سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسی وقت وہ نعلی کار سڑک کے کنارے رکی، اور اس میں سے کچھ فٹنڈے نکلے، وہ اس زخمی کی تلاش میں تھے۔ ہم زخمی کو اٹھ کر مخالف سمت میں لے آئے اور وہ تلاش کرتے ہوئے دور نکل گئے، تاہم ان کا ایک ساتھی کار کے پاس موجود تھا، ہم نے اسے پتھر مار کر بے ہوش کر دیا اور زخمی کو کار میں ڈال کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ شہر کی طرف اس لیے نہیں جاسکے کہ کار کو موڑنا پڑتا اور اس دوران فٹنڈے سڑک تک پہنچ سکتے تھے۔ پس جناب کہانی صرف اتنی ہے۔ اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس میں ہم کس قدر قصور وار ہیں۔ اور ہمارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، کیا ہم اس کے حق دار بھی ہیں یا نہیں۔“ یہاں تک کہہ کر محمود خاموش ہو گیا۔

انسپیکٹر سجاد چند لمحوں تک سوچ میں ڈوبا رہا، آخر اس نے کہا:

”ٹھیک ہے۔ میں ملک صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

”اس میں ملک صاحب سے بات کرے کی کیا ضرورت ہے۔“

”آپ نہیں جانتے۔ اس کی کیا پوزیشن ہے۔ مجھے جیسوں کو تو کھڑے معائنہ نوکری سے لکھو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون پر نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ آخر سلسلہ طے پڑا۔

”ہیسوسر ایک سیٹے میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔ جی جی ہاں۔ انسپیکٹر سجاد یوں رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔

”دوسری طرف کی بات سننے کا پھر تعبیر کر لیا۔“

”لو سر۔ ابھی تک میں نے انھیں حوالات میں بند نہیں کیا۔“

دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہہ گیا، انسپیکٹر سجاد نے بوکھلا کر ریسورر دکھ دیا اور ان سے پوچھا:

”ملک صاحب کو یہ س کر بے تحاشہ غصہ کیا ہے کہ اب تک میں نے آپ لوگوں کو حوالات میں بند کیوں نہیں کیا

ہے۔ لہذا انھوں نے میری

کوئی بات بھی سننے سے انکار کر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ ابھی میرا بندوبست کرتے ہیں۔“

”بہنو بست کرتے ہیں۔“ محمود خیرن ہو کر بولا۔  
 ”جی ہاں! مجھے ملازمت سے نکلوانے کے لیے کسی کو فون کر دیں گے اور کیا۔“ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔  
 ”مگر ہمیں حواالت میں ڈال کر آپ کی ملازمت بچا سکتی ہے تو پھر آپ ایب کر مزیں۔“ فرزانہ نے جدی سے کہا۔  
 ”بہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ اب میں آپ لوگوں کو حواالت میں بند کروں گا بھی نہیں۔  
 بہ تو کیا آنے والی ہی نہیں بد کرے گا۔“  
 ”کیا کہا۔ اتنی جدی کوئی اور اسپیکر یہاں۔“  
 ”ہاں! ملک دلیر سب کچھ کر سکتے ہیں۔“  
 ”اوہ!“ وہ دھچک سے رہ گئے۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ بیرنگ کی جیب تھانے میں داخل ہوئی۔ سلوٹ مارنے کی تواریں گونج  
 اٹھیں۔ اسپیکر سچا دھیر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے قمر قمر کانپتی آواز میں کہا  
 ”ف خدا... ایس بی صاحب آگئے۔“

”محمود، فاروق و فرزانہ ابھی تک اسپیکر سجاد کے سامنے کھڑے رہے تھے۔ لہذا انھیں کھڑا ہونے کی ضرورت پیش  
 نہیں آئی۔ اسی وقت ایک لمبے قد کا پریس میسر دفتر میں داخل ہو۔ اس کا چہرہ غصے سے لال سمجھو کا ہو رہا تھا۔ اس  
 کے اندر داخل ہوتے ہی اسپیکر سجاد اپنی میز کے پاس سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا، اس نے ایک روردر سلوٹ مارا۔

”اسپیکر سجاد، یہ تم نے کیا کیا۔ ملک صاحب کا حکم ماننے میں اتنی دیر کر دی۔“  
 ”میں سر میسر مجھ سے یہ بھیا تک غلطی ہوئی ہے سر مہ۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“  
 ”شرمندہ ہونے سے بہ کیا فائدہ ہوگا۔ ملک دلیر نے تمہاری ملازمت بالکل ختم کر دینے کا حکم دید ہے۔ تم ہی  
 بتاؤ اب میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”یہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔“ اسپیکر سجاد نے کانپ کر کہا۔  
 ”تم جانتے ہی ہو سجاد ہم اس کے سامنے کس قدر مجبور ہیں، وہ صدر صاحب کو ایک فون بھی کر دیں تو ہم سب  
 ملازمت سے نکال دیے جائیں۔“

”میں سر یہ تو ہے لیکن سر میں تو آپ کا۔“  
 ”ٹھیک ہے سجاد تم میرے سامنے ہو لیکن میں ملک دلیر کے حکم کی خلاف ورزی کس طرح کر سکتا ہوں، اس  
 طرح تو خود میں بھی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا، لیکن یہ بتاؤ ملک صاحب کا وہ کون سا حکم ہے جس میں کوتاہی  
 ہو گئی۔“

”اُس کا حکم ان قیتوں کے بارے میں تھا۔ یہ کہ انھیں حوالات میں بند کر دیا جائے اور پھر پرجہ درج کر کے انھیں جیل بھجوا دیا جائے۔“

”نہوں نے کیا کیا ہے؟“

”میں عرض کرتا ہوں سر۔“ اس نے کہا اور ن کا بیان دہرا دیا۔

”تو تم انھیں حوالات میں ڈال دیتے۔ تمہارا کیا حرج ہو رہا تھا۔“ ایس پی صاحب نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

”میں انھیں حوالات میں بند کرانے ہی والا تھا کہ نہوں نے ایک عجیب بات کہہ ڈالی۔“ انسپکٹر سجاد بے چارگی کے عالم میں ہوا۔

”عجیب بات۔۔ کون سی عجیب بات؟“

”یہ کہ یہ انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں۔“

”کیا!؟“ ایس پی صاحب اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”درا نہوں نے جو کچھ کیا اس رنجی کی جان بچانے کے لیے کیا۔ ان حادثات میں انھیں حوالات کس طرح بھیجا جا سکتا ہے، یہی بات بتانے کے لیے میں نے ملک صاحب کو فون کیا تھا، لیکن انھوں نے میری بات سنی ہی نہیں، بس یہ سن کر غصے میں آ گئے کہ ابھی تک ان قیتوں کو حوالات میں بند کیوں نہیں کیا گیا۔“

”ہوں، بات دراصل یہ ہے سجاد کہ تم بالکل احمق ہو۔“

”جی کیا فرمایا میں احمق ہوں۔“

”ہاں! اس میں ایک فیصد بھی شک نہیں ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“ انسپکٹر سجاد نے بوکھلا کر کہا۔

”غصہ نہ بتاتا ہوں، تم احمق کس طرح ہو۔“

یہ کہہ کر ایس پی صاحب نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر گھمانے لگے۔ آخری بے

”ہیو ملک صاحب۔ آپ کا خادما ایس پی مشکور بول رہا ہوں۔ جی، جی ہاں بالکل۔ میں نے اتنے ہی انسپکٹر

سجاد کو ملازمت سے برطرف کر دیا ہے اور ان قیتوں کو حوالات میں ڈال دیا ہے۔ آپ کا حکم ہو اور اس پر عمل نہ کیا

جائے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے جناب جی۔ بالکل۔ اب میں بھی آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ

جناب کہ یہ قیتوں بالکل بے قصور ثابت ہوئے ہیں، انھوں نے تو دراصل ایک رنجی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ

رنجی ایک جیپ میں بھاگا جا رہا تھا کہ جیپ کا تائر پھٹ گیا۔ وہ شخص جنگل میں گھس گیا، اس کے پیچھے کچھ دشمن تھے

وہ آپ کی کار میں وہاں تک پہنچا اور اس رنجی کی تلاش میں جنگل میں گھس گئے۔ اس وقت یہ قیتوں سیر کرتے ہوئے اس

جگہ سے غرور ہے تھے، انھوں نے رنجی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی نہ کسی طرح آپ کی کار میں اسے ڈر کر بھاگ چکے۔ اور ہمارے شہر کے اس پرنیوٹ ہسپتال میں اسے داخل کرا دیا۔ اسی وقت آپ کی کار شناخت کر لی گئی۔ آپ تشریف لائے اور انھیں حوالت میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اب حالات اور واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ جو آپ حکم فرمائیں، کیا جائے۔“

”تو انھوں نے کسی رنجی کو ہسپتال میں داخل کرایا تھا۔“

”جی ہاں بالکل۔“ ایس پی صاحب نے فوراً کہا۔

”منظور صاحب۔ یہ ضرور کوئی گہری سادش ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ سادش میرے خلاف ہو۔“ اس کام کے لیے میری کار ہی کیوں چرائی گئی.. لہذا وہ تینوں حوالت میں ہی رہیں گے۔ آپ مزید تفتیش کریں اور پھر مجھے فون کریں۔“

”بہت بہتر سر۔“ ایس پی صاحب نے گھبرا کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

”وہ انھیں بے قصور سمجھنے پر تیار نہیں۔ مطلب یہ کہ تمہارے ساتھ میں بھی پھنس گیا۔“

”ب۔ اب کیا ہو گا؟“ (جاری ہے)



”ہمیں چاہیے کہ انسپکٹر جمشید کو فون کر دیں۔ وہ خود ہی اس معاملے سے نبت لیں گے۔ ہماری جان چھوٹ جائے گی، مرنی ایں ملک صاحب کو یہ اطمینان تو دے دیں کہ انھیں حواسات میں ڈال دیا گیا ہے۔“ یہ کہتے وقت وہ دھمکے انداز میں مسکرائے۔

”آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھیے! میں جانتا ہوں، آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہم کس قدر مجبور ہیں۔“

”اسی ملازمت سے کیا فائدہ جناب۔ کہ آدمی نصاب سے کام بھی نہ لے سکے۔ آپ لوگوں کو چاہیے امداد متوا سے جواب دے دیں۔“ فرار نہ کرنے جیسے کئے لہجے میں کہا۔

”اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ملازمت سے نکل کر بھی ہمیں ملک دہلی کی دشمنی مٹا لینا ہوگی۔“

”تب پھر یہ کیا رہ گئی ہوگی؟“ محمود نے کہا۔

”اس بات کو چھوڑیے۔ اور یہ سوچئے کہ ب کیا کیا جائے؟“

”یہ سوچنا تو آپ کا کام ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے، چونکہ ہمارا کوئی جرم نہیں، اس لیے ہمیں جانے کی اجازت دی جائے۔ پیسے ہی ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے۔ گھر پہنچنے میں بھی ایک گھنٹہ اور لگے گا۔“ فاروق بولا۔

”میں عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اور اس کے سوا کوئی راستہ نہیں سوچ رہا کہ انسپکٹر جمشید کو فون کر دیا جائے، اپنا نمبر بتائیں۔“

محمود نے کندھے اچکاتے ہوئے نمبر بتا دیا اور پس پی منظور نمبر گھمانے لگے۔ محمود نے گھر کے نمبر بتائے تھے، کیونکہ دفتر کا وقت تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ سلسلہ طے پرا پس پی منظور نے کہا:

”سیو۔ کو صاحب۔“

”میں بیگم جمشید ہوں۔ آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”انسپکٹر جمشید سے۔“

”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”میں اس سے محمود، فاروق اور فرزانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔“

”کیا مطلب۔ کیا آپ کو اس کے بارے میں معلوم ہے۔ تو پھر مہربانی فرما کر آپ مجھے بتا دیں۔“

”تو پھر سنیے، میں ایس پی منگور ہوں، شاہ پور سے بول رہا ہوں، آپ کے تینوں بچے یہاں کے سرکاری تھانے میں موجود ہیں، ایک انجمن میں جٹلا ہو گئے ہیں۔ انسپکٹر حشیدی انھیں اس انجمن سے نجات دے سکتے ہیں، لہذا وہ جس قدر جلد ممکن ہو، یہاں پہنچ جائیں۔“

”جی بھتر! میں آپ کا پیغام انھیں دے دوں گی۔ کیا آپ اس میں سے کسی سے میری بات کرا سکتے ہیں؟“

”جی ہاں اکیس نہیں۔ لیجیے بات کر لیں۔“

یہ کہہ کر ایس پی نے ریسیور محمود کے ہاتھ میں دے دیا۔

”ہیلو امی جان۔ محمود بول رہا ہوں، ہم یہاں بالکل خیریت سے ہیں، ٹکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں، ہاں ابا جان کو اطلاع کرنا ضروری ہے۔ کیا آپ کو مصروف نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔“

”نہیں اتھوڑی دیر پہلے انھوں نے فون کر کے تمہارے بارے میں پوچھا ضرور تھا۔ وہ بھی تمہارے بے ٹکرمند ہیں۔“

”جب تو وہ جلد ہی پھر فون کریں گے۔“

”ہاں بالکل۔ تم فکر نہ کرو، لیکن معاملہ کیا ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔ ایک شخص کی زندگی بچانے کی وجہ سے ہم انجمن میں جٹلا ہو گئے ہیں۔“

”اچھا۔ جونکی اس کافون ملا، یادہ خود آئے، انھیں شاہ پور بھیج دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔“

”شکریہ امی جان۔“

محمود نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ ایک بیسی کا رتھانے میں داخل ہوئی اور انھیں یوں لگا جیسے تھانے میں اُل چلی ہو۔ ساتھ ہی ایس پی منگور اور انسپکٹر سجاد کا رنگ اڑتا نظر آیا۔ انھوں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ ملک دیکر چلے آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر طنز بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔

”تو یہ تینوں حوالات میں بند کیے جا چکے ہیں۔“

”نچ، جی ہاں بالکل، بند کر دیے گئے تھے۔ آپ ہی نے فرمایا تھا کہ ان کے خلاف مزید تفتیش کروں، چنانچہ ان سے سزا دینے کے لیے انھیں باہر نکالوا دیا گیا ہے۔“ اس پی منگور نے جلدی جلدی سفید جھوٹ بولا۔

”لیکن میرا دعویٰ ہے۔ یہ لوگ بھی تک حوالات میں ڈالے ہی نہیں گئے۔“

”سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ خیر، ابھی دیکھتا ہوں۔ یہ حوالات میں کیسے نہیں ڈالے جاتے۔“ یہ کہہ کر ملک دیکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور فون کا ریسیور اٹھ کر گھمنا لگے۔ آخر پانچ منٹ بعد انھوں نے کہا:

”ہیو۔ طولانی صاحب۔ شاپور کی انتظامیہ ایک دم سچی ہے، میں نے انسپکٹر سجا کے حوالے تین مجرم کیے اور انہیں حوالات میں بند کرنے کی ہدایت کی لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی، پھر میں نے اس پی منظور کو بھیجا، انہوں نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی، لہذا مجھ سے فون پر جھوٹ بول دیا کہ ان تینوں کو حوالات میں بند کر دیا ہے۔“

”یہ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ ملک دیمبر صاحب۔ وہ لوگ اور آپ کا حکم نہیں مانیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”یہ ہو چکا ہے طولانی صاحب، اور آپ پوچھ رہے ہیں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ ملک دیمبر نے زمان کر کہا۔

”اوہ خیر آپ فون کار۔ سیورائس پی منظور کو دیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کیسے دوں۔ میں تو اپنے طور پر ن دونوں کو دامت سے نکال بھی چکا ہوں۔“

”اوہ ہاں اٹھیک تو ہے۔ میں غلط کہہ گیا۔ تو آپ ری سیور یہاں کے سب انسپکٹر کو دیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ یہ کہتے ہی ملک دیمبر نے ٹھنٹی بجائی، فوراً ہی ایک کانسٹیبل ندر داخل ہوا۔

”سب انسپکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔“

”اوکے سر۔“ اس نے کہا اور ایک کمرے کی طرف مڑ گیا۔

جلدی ہی سب انسپکٹر اندر داخل ہوا:

”یہ یو بھی۔ گور رطوں نی صاحب کا حکم سنو۔“

”طولانی صاحب۔“ وہ ہلکے اور تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے ری سیور پکارتے ہوئے بولا

”یس۔ یس۔ یس سر۔“ اس کے حلق سے یہ الفاظ بہت مشکل سے نکلے۔

”میں تمہیں بطور انسپکٹر ترقی دیتا ہوں۔ تم ملک صاحب کے احکامات کی تعمیل کرو۔“

”او۔۔۔ اوکے۔۔۔ اوکے سر۔“

”اب ری سیور ملک صاحب کو دو۔“

”یس سر۔“ اس نے کہا اور ری سیور ملک صاحب کو دے دیا۔

”ہیو ملک صاحب۔ سب انسپکٹر کو بطور انسپکٹر ترقی دے دی گئی ہے۔ اب وہ آپ کے احکامات کی تعمیل کرے گا۔“

”شکر یہ طولانی صاحب۔“

دراں کے لیے ہدایت یہ ہیں کہ انہیں ہر طرف کیا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ یہی ہونا چاہیے۔“ ملک صاحب نے کہا، پھر وہ ری سیور رکھ کر ان کی طرف مڑے

”تم دونوں کو ہر طرف کر دیا گیا ہے، سب انسپکٹر اب انسپکٹر ہیں۔ انسپکٹر صاحب ن تینوں کو فوری طور پر حوالات بھیجا

دیکھتے ہیں چاہتا ہوں، ان کی ضمانت نہ ہو۔“

”اوکے سر“ آپ کے احکامات کی حرف بہ حرف تعمیل ہوگی۔“ نئے انسپکٹر نے باادب ہو کر کہا، ”اور کھنٹی بجی۔ فوراً ہی ایک کانسٹیبل اندر داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ حیران نہ رہا تا تو کیا کرتا۔ میں پلی صاحب اور انسپکٹر صاحب تو کھڑے تھے اور سب انسپکٹر انسپکٹر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔“

”اس تینوں کو حوالات میں ڈال دو۔“ خیردار میری اجازت کے بغیر ان سے کوئی ملاقات نہ کرنے پائے۔“

”میں سر۔“ اس نے گھبرا کر کہا اور تینوں کی طرف بڑھا

”چلو۔“

چلو اس نے یہے غماز میں کہا تھا جیسے وہ کوئی بڑے بھاری مجرم ہوں۔ تینوں نے سب پر ایک نظر ڈالی اور کانسٹیبل کے ساتھ باہر نکل آئے۔۔۔

”قانون کی اس چار دیواری میں قانون کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، لہذا ہمارے لیے اس کا حکم ماننا ضروری نہیں رہا۔“ محمود نے دلی آواز میں کہا۔

”پھر تم کیا کہتے ہو؟“ فرزانہ بولی۔

”ہم حوالات میں بند نہیں ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”بھئی دیکھو کہیں ہم خطرہ تو مومن نہیں لے رہے؟“

”دیکھ جائے گا۔ ہم نے کیا جرم کیا ہے کہ حوالات کی بدبود روٹھری میں بند ہوں۔“

کانسٹیبل انھیں لے کر حوالات کے دروازے پر پہنچی گیا اور چینی میں سے چابی نکال کر تال کھولنے لگا، انھوں نے دھر

آدھر دیکھا اور بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑے اور اس قدر تیز دوڑے کہ ان کی آن میں تھانے سے باہر تھے۔

انھوں نے اپنے پیچھے ارے ارے کی آوازیں سنیں۔

لیکن ارے ارے کی یہ آوازیں بھلا انھیں کس طرح روک سکتی تھیں۔ (جاری ہے)

صدر صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے وہ تھری سے سوچ رہے تھے۔ آدھ گھنٹا پہلے کرم خان کے کمرے میں ڈاکٹر بھدانی ہی موجود تھا، تو پھر کیا ڈاکٹر بھدانی نے ہی اس کے جسم میں زہر داخل کیا تھا؟ اس کے سوا بھلا اور کیا کہا جاسکتا تھا۔ اور اگر اکرام خاں کو ہر واقعی ڈاکٹر بھدانی نے دیا تھا تو اس معاملے کی جزیں شاید بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ بھی صدر صاحب ڈاکٹر بھدانی صاحب کی رہائش گاہ میں ہی موجود تھے۔ اگر وہ اس سائڈ میں شریک تھے تو پھر صدر صاحب خطرے میں تھے۔ انسپکٹر جمشید اس پر پریشان تھے۔

آخر جیپ کو تندی اور طوفان کی طرح دوڑاتے اور رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ یہاں حالت جوں کے توں تھی۔ انھیں فوراً ہی اندر پہنچا دیا گیا۔ صدر صاحب کو صحیح سلامت دیکھ کر ان کی جاں میں جان آئی۔

”ہاں جمشید کیا رہا؟“ وہ بولے۔

”تفتیش بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔“ یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر رحمانی کی طرف مڑے۔

”ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر بھدانی کہاں ہیں؟“

”دوسرے کمرے میں آرام کر رہے ہیں، کیونکہ دو گھنٹے بعد ان کی ذیوی شروع ہو جائے گی۔ میں رخصت ہو جاؤں گا۔“

”میں ن سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ ہر نکل گئے اور ایک نمرن سے معلوم کر کے اس کمرے تک پہنچے۔ دستک دی تو اندر سے ڈاکٹر بھدانی کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”انسپکٹر جمشید۔“

”جیسے آئیے انسپکٹر صاحب۔ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔“ انھوں نے کہا، وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”شکریہ جناب۔ معافی چاہتا ہوں، آپ کو رحمت دینے چلا آیا، مگر انکے یہ آپ کے آرام کا وقت ہے۔“

”میری فکر نہ کریں۔“ انھوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کرم خاں مر گیا ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے سرسراہٹ سے کہا۔

”مر گیا ہے۔“ ڈاکٹر بھدانی نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں“ وہ سرچکا ہے۔

”لیکن کیسے سر کا زخم تو بہت معمولی تھا۔“ انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اس کی موت سر کے زخم سے نہیں ہوئی۔ اس کے جسم میں تو دراصل زہر داخل کیا گیا ہے،

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس زہر نے فوراً کام نہیں کیا۔ دیے جانے کے نصف گھنٹہ بعد کام کیا ہے۔“

”آدھ گھنٹہ بعد آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر ہدانی چونک اٹھے۔

”یہ کہ آدھ گھنٹہ پہلے آپ اکرام خان کے پاس تھے۔ آپ نے ہی اس کے زخم پر پٹی باندھی تھی۔ اور انکشن بھی دیا

ہو گا، کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ نے اس دوران اس کے جسم میں زہر داخل کیا ہو۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر ہدانی کا رنگ اڑ گیا۔

”حالت و واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ موقع صرف اور صرف آپ کو حاصل تھا۔ جب میں پہلی

بار اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو کمر خان کے ساتھ کمرے میں صرف آپ موجود تھے۔ اس سے میں کیا مطلب

لگاؤں۔“

”آپ بالکل غلط مطلب نکال رہے ہیں۔ اس کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں، بعد ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ آخر

مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

”ضرورت تھی۔ کمر خان اگر زندہ رہتا تو ہم اس سے انگو ایسے کہ اس سارشل میں اسے کس نے شریک کیا ہے،

جب کہ آپ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اس کا نام سامنے آئے، لہذا آپ نے اسے زہر دے دیا۔“

”آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں۔ آپ کو اپنی اس سوچ پر بعد میں افسوس ہو گا۔“

”خیر وہ بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ میں آپ کو حراست میں لے رہا ہوں، کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”افسوس! میں مجبور ہوں۔“ انھوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا، پھر بیرونی دروازے پر آئے۔

یہاں اکرام دور کچھ ماتحت موجود تھے۔

”اندر ڈاکٹر ہدانی ایک کمرے میں موجود ہیں۔ میں دروازہ باہر سے بند کرنے آیا ہوں۔ آپ ان کے

ہاتھوں میں اٹھکڑیاں پہنا دیں اور ان کی بھی نگرانی کر لیں۔ ابھی ہم انھیں حوالات تک نہیں پہنچا رہے۔“

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر اندر چلا گیا۔ انسپکٹر جشیو صدر صاحب کے کمرے کی طرف

مڑے ہی تھے کہ ادھر سے ڈاکٹر حنفی صاحب بدحواسی کے عام میں آتے نظر آئے۔

”انسپکٹر صاحب۔ یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟“

”کیا کرتا پھر رہا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”میں نے سنا ہے۔ آپ ڈاکٹر ہمدانی صاحب کو حراست میں لے رہے ہیں۔“

”ہاں آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ یہاں بہت مجبور ہو کر کیا گیا۔ جہاں تک میری تفتیش کا تعلق ہے، انھوں نے ہی اکرام خان کو رہ دیا ہے۔“

”یہ... یا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میرا اندازہ یہی ہے۔ تاہم یہ غلط بھی ہو سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر ہمدانی صاحب کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا، کیونکہ یہ سازش ملک کے صدر کے خلاف ہے اور جب تک تمام سازشیں پکڑے نہیں جاتے، اس وقت تک ان کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”ہوں آپ ٹھیک کہتے ہیں، خیر آپ کی مرضی، ویسے میں تو یہی کہوں گا۔ ڈاکٹر ہمدانی صاحب اس سازش میں شریک نہیں ہو سکتے، میں انھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”خیر یہ تو وقت بتائے گا۔“ انسپلر جمشید نے کندھے اچکائے اور فون کی طرف بڑھے۔ مگر کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد انھوں نے کہا

”ہیو جیمز محمود، فاروق اور فرزند لوٹے یا نہیں؟“

”بھی تک نہیں، لیکن اس کے بارے میں اطلاع موصول ہو گئی ہے۔“ دھڑے جواب ملا۔

”دوبری گڈ.. کیا اطلاع ملی ہے۔“

”وہ شاہ پور میں ہیں۔ وہاں کے مرکزی تھانے میں۔ اور کسی انجمن میں جٹا ہو گئے ہیں۔ آپ کی دہا ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔“

”وہ شاہ پور کس طرح پہنچ گئے؟“ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی چاہیں۔ میں خود حیراں ہوں۔“

”تو پھر تم نے میرے فون کا انتہا کیوں کیا، کرم کو فون کر دیا ہوتا۔“

”میں نے سوچا تھا، لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ مجھے یہ اچھا محسوس نہیں ہو۔“

”ہوں خیر میں دیکھتا ہوں۔ کیا معاملہ ہے۔“

اکرام اور نگرالوں کو ہدایات دے کر وہ باہر نکل آئے۔ اب وہ جیپ میں بلا کی رفتار سے شاہ پور کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ وہ محمود، فاروق اور فرزند کے لیے نہیں، اس انجمن کے بارے میں جاننے کے لیے جا رہے تھے۔

محمود، فاروق اور فرزند کے لیے تو وہ پھر بھی جاسکتے تھے، ان کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی، یہی بہت تھا۔

آخری سرزئی تھانے کے سامنے اس کی جیپ رکی، دو بچے اتر کر تھانے میں داخل ہوئے تو اندر مل چل سی چکی تھی۔  
 نہ جانے کیوں ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کسی کاشیمل نے ان کی طرف آنکھ اٹھ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر وہ  
 سیدھے انپکڑ والے کمرے میں جا گئے۔ یہاں ایک سب انسپکٹر، انسپکٹر کی کرسی پر موجود تھا۔ دو ایک ایس پی اور  
 ایک انسپکٹر کھڑے تھے۔ ایک کرسی پر ایک ہارعب سا آدمی بیٹھا تھا، انھیں یہ آدمی جانا پہچانا لگا۔

”آپ آپ کون ہیں؟“ سب انسپکٹر نے بھٹا کر کہا۔

”خیر تو ہے۔ آپ لوگ بہت پریشان نظر رہے ہیں۔“

”بھی بھی تمیں شیطان تھانے سے بھاگ نکلے ہیں۔ ہم ان کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اور شہر بھر کی پولیس انھیں  
 گرفتار کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔“ سب انسپکٹر نے جلدی جلدی کہا۔

”لیکن اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ سب انسپکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کے فیسر کھڑے ہیں۔“ انسپکٹر  
 جمشید حیدر ان ہو کر بولے۔

”آپ کون ہیں۔“ دھل اندازی کرنے والے۔  
 ”میں انسپکٹر جمشید ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ میرے بچے محمود، فاروق اور فرزند نے یہاں موجود ہیں اور کسی ابھمن میں  
 جلا ہو گئے ہیں۔“

”کیا کہا۔ انسپکٹر جمشید محمود، فاروق اور فرزند۔ ارے، کہیں وہ آپ کے ہی بچے تو نہیں تھے جو بھاگ نکلے  
 ہیں۔“

”میرے بچے بھاگ نکلنے کے عادی نہیں۔“ انھوں نے منہ بتایا۔

”وہ آپ کے ہی بچے تھے جناب۔“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ملک دمیر نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا۔

”اسی بچے تو میں نے انھیں حوالات میں نہیں ڈالا تھا۔“

”ہاں نہیں کیا چکر ہے۔ ذرا وضاحت کر دیں۔“ انسپکٹر جمشید جھنجھڑا گئے۔

”ملک صاحب، کیا ہمیں اجازت ہے انھیں بتادیں؟“

”نہیں۔ آپ دونوں جاسکتے ہیں۔“ ملک دمیر نے کہا۔

”بہت بہتر آؤ سچا چلیں۔“

”آخر یہ کیا ماجرا ہے؟“

”آپ تشریف رکھیے جناب۔ ہم بھی آپ کو ساری بات بتاتے ہیں۔“

اس وقت ایس پی اور انسپکٹر کمرے سے نکل چکے تھے، انسپکٹر جمشید کا ہارے حیرت کے نہ حال تھا۔ ”حروہ کرسی پر  
 بیٹھ گئے۔۔ اور بولے۔“

”ہاں اب بتائیے۔“ (جاری ہے)



زخمی

اشتقاق احمد

قسط نمبر 11

”آپ کے بچوں نے ملک وکیر صاحب کی کار چرائی ہے۔“

”کار چرائی ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اس سلسلے میں انھیں حوالت میں بدلیا جا رہا تھا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔“

”ضرور آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”جب ہم انھیں گرفتار کر لیں گے تو پھر آپ کے سامنے ان کا بیان سنا جائے گا، اس وقت ان کی زبانی سن لیجیے گا۔“

”بہت بہتر... سن لوں گا... شکریہ۔“

”انھوں نے کہا در کمرے سے نکل آئے۔ سب انسپکٹر اور ملک وکیر نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جیپ

میں بیٹھے اور تھانے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک آواز نے انھیں روکنے پر مجبور کر دیا

”ایک منٹ انسپکٹر صاحب۔ ساری بات تو آپ کو صرف ہم بتا سکتے ہیں۔“

انھوں نے چونک کر سڑک کے کنارے کی طرف دیکھا۔ اس پی اور انسپکٹر وہاں کھڑے نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر

حیرت اور بڑھی۔ جیپ ان کے نزدیک کرتے ہوئے انھوں نے کہا

”تشریف رکھیے۔“

دونوں کی جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ جیپ چل پڑی تو انسپکٹر جمشید بولے

”فرمائیے۔ آپ مجھے بتانا چاہتے ہیں؟“

انسپکٹر سجاد نے پوری تفصیل کہہ سنائی

”اوہ۔ تب تو آپ سب سے پہلے مجھے اس ہسپتال لے چلے۔ میں اس زخمی سے ملاقات کرنا پسند کروں گا۔“

”جی کیا فرمایا۔ زخمی سے ملنا پسند کریں گے۔ گویا آپ کو اپنے بچوں کی فکری نہیں۔“

”زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ پولیس انھیں گرفتار کر لے گی۔ ان کا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے تو یہ جاننا

ضروری ہے کہ وہ زخمی کون ہے۔“

”تو پھر اب جو سڑک دائیں طرف مڑے، اس پر موڑ لیجیے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ انھوں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہسپتال کے سامنے اتر رہے تھے۔ ان کی رہنمائی میں وہ زخمی کے کمرے تک پہنچے۔ اسی وقت

سنانے سے ایک ڈکٹر صاحب آتے نظر آئے

”اس کمرے کے زخمی سے تو نہیں ملے آئے؟“ انھوں نے پوچھا:

”جی جی ہاں آئے تو اسی سے ملے ہیں۔“

”سوری! آپ اس سے نہیں مل سکتے۔“

”کیوں۔“ انسپکٹر جمشید پوئے۔

”جائز نہیں ہے حکام کی ہدایت یہ ہے کہ اس مریض سے کوئی بھی ملے آئے اسے ملے نہ دیا جائے۔ بلکہ

اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دی جائے۔“

”تو پھر آپ

ہمارے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دیں۔“

”آپ کمرے کے باہر تشریف رکھیں، پہلے میں مریض کو دیکھوں کہ اب اس کا کیا حال ہے، پھر حکام کو فون کروں

گا۔“ اس نے کہا اور کمرے میں داخل ہو گیا، وہ ایک دوسرے کام سے دیکھتے رہ گئے۔

”یہ حکامات کب جاری کر دیے گئے؟“ ایس پی منظور حمید ان ہو کر پوئے۔

”شاید ہمارے وہاں سے نکل آنے کے بعد۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”خیرت ہے۔ آخر یہ ہو گیا رہا ہے۔“

”رے۔“ انسپکٹر جمشید چونک اٹھے، پھر کمرے کے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ انھوں

نے تالے کے سوراخ میں سے اندر جھانکا اور پھر نہ جانے انھیں کیا ہوا۔ حیرانی سے پیچھے ہٹے اور دروازے پر ایک ٹکڑا لٹا

کر دی۔ یہ ٹکڑا انھوں نے پورے زور سے ماری تھی۔ دروازے کے قبضے اکٹڑ گئے، ایس پی منظور اور انسپکٹر سجاد رے

ارے۔ یہ کیا کرتے رہ گئے۔ اتنے میں انسپکٹر جمشید کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

اندر کا منظر عجیب تھا۔

○

تینوں دوڑتے ہوئے اچانک ایک گلی مڑ گئے اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے نہ جانے کہاں کے کہاں لٹل آئے،

اب تینوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ”خیر محمود نے زکتے ہوئے کہا۔

”بس کرو۔۔ کافی بھاگ لیے ہیں۔“

”میں تو سمجھا تھا، آج ہم بھاگتے بھاگتے دنیا سے باہر نکل جائیں گے۔“ قاروق نے منہ بتایا۔

”تمہارے بچنے سے کیا ہوتا ہے۔“ مرراند نے بھڑک کر کہا۔

”سوس یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔“ محمود بول۔

”ہم سیدھے اپنے شہر جائیں گے اور کیا کریں گے، یہاں رہے تو ضرور پھر سے پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”اور اس رخصتی کا کیا ہے گا۔ کیا ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا چاہتے، وہ کون ہے۔ اس کے پیچھے وہ لگ کیوں لگے ہوئے تھے، کیا انھوں نے ہی اسے زخمی کیا تھا۔ اور کیوں کیا تھا۔ یہ باتیں ہمیں اس کے ہوش میں آنے پر ہی معلوم ہو سکتی ہیں، اور ہو سکتا ہے، وہ اس وقت تک ہوش میں آچکا ہو، لہذا کیوں نہ ہم لگے ہاتھوں ہسپتال سے بھی پکڑ لگاتے جائیں۔“ محمود نے تجویز پیش کی۔

”اور لگے ہاتھوں پولیس کے ہاتھ لگ جائیں۔“ فاروق حل بحن کر بول۔

”بھئی تم پولیس سے اس قدر ڈرنے کب سے لگ گئے؟“ فرزانہ نے بھٹا کر کہا۔

”مگر ہم بھاگ نہ رہے ہوتے تو حوائت کی سیر کر رہے ہوتے اس وقت۔ ملک دلیہ یہاں کا تو معلوم ہوتا ہے۔ گورنر تک اس کی بات نہیں بنا سکتے۔“

”ہوں اخیر کوئی بات نہیں، ہم زخمی سے ملے بغیر نہیں جائیں گے، ورنہ وہوں میں الجھن رہے گی۔“ محمود نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”محمود میں تمہاری تائید کرتی ہوں۔“

”بالکل ٹھیک۔۔ تمہیں محمود کی تائید کرنی بھی چاہیے۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔“ فاروق نے بے بسی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

تینوں نے ایک پاس سے گزرتی ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ہسپتال پہنچے۔ زخمی کا کمرہ انھیں معلوم ہی تھا، سیدھے اسی طرف بڑھ گئے۔ کمرے کے دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی زخمی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کی سمجھیں بدھیں۔

”بیوی زخمی صاحبہ اب آپ کا کیا حال ہے؟“ فاروق نے اس پر چمکتے ہوئے کہا۔

”زخمی صاحبہ یہ کیا نام ہوا؟“ فرزانہ نے اسے گھور دیا۔

”بھئی ہمیں ن کا نام معلوم جو نہیں۔“

”تو شانے سے پکڑ کر ہلا کر دیکھو نا۔“ فرزانہ بولی۔  
فاروق نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

”بھئی کب تک بے ہوش رہو گے، بے ہوش رہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور میرا خیال ہے، آپ وہ حد عبور کر

چکے ہیں، اب مزید بے ہوش رہتا یا نکل مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لیے میرا نیک مشورہ یہی ہے کہ آنکھیں کھول دیں اور کچھ پتا آتا پتا نہیں، تاکہ ہم آپ کے گھرواؤں کو اطلاع دے سکیں۔“ فاروق کہتا چلا گیا۔

”ہوں! کچھ اور بھی کہہ ڈالو۔ کوئی کسر نہ رہ جائے۔“ فرزانہ جل گئی۔

”آج تم پر چلنے بھسنے کا بھوت تو سوار نہیں ہو گیا۔“ فاروق حیرت ہو کر ہوا۔

عین اسی وقت رُخمی نے آنکھیں کھول دیں۔ چند سیکنڈ تک وہ چاروں طرف نظریں گھما گھما کر دیکھتا رہا، انھوں نے اپنے ہونٹ بھیجنے لیے، دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ آخر اس کے ہونٹ ہلے۔

”مم... میں... میں کہاں ہوں۔“

”چھ سوال ہے، اس سے اچھا سوال آپ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔ محمود اور فرزانہ نے اُسے گھورا۔

”کیا مطلب؟“ رُخمی حیرت ہو کر ہوا۔

”آپ بہتار میں ہیں، رُخمی حالت میں ہمیں ایک جنگل میں پڑے پڑے تھے۔“

”رُخمی حالت جنگل اور تو میں بہتار میں ہوں، اُف خدا، دو دو دو۔“

”یہ تین بار وہ کہے کی کیا ضرورت پڑ گئی آپ کو؟“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”مم۔ میرا مطلب ہے، وہ ہوگ۔“ وہ پھر کہتے کہتے رک گیا۔

”چھ! ہم سمجھ گئے۔ آپ کا مطلب ہے، وہ لوگ جنھوں نے آپ کو رُخمی کیا تھا۔“

”ہاں ہاں... وہ کہاں چلے گئے۔“

”بہت پیچھے رو گئے۔ ہم آپ کو ایک کار میں ڈال کر اس بہتار تک لے آئے تھے۔“

”دو۔ تب تو وہ یہاں بھی پہنچ جاتیں گے۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، پھر اس کے منہ سے ایک چٹا نکل گئی اور وہ ساکت لیٹ گیا۔

”بیٹے! رہے۔ آپ اس قابل نہیں کہ چل پھر سکیں۔“

”ہاں شاید... سچی بات ہے۔“

”پنے بارے میں بتائیے۔ آپ کون ہیں، نام کیا ہے، آپ کا گھر کہاں ہے۔ آپ کو رُخمی کرنے والے کون لوگ تھے؟“ محمود نے جلدی جلدی کہا۔

”مم... میں... میں۔“ وہ ہکا بکا کر رہ گیا۔

(چاری ہے)

زخمی

اشتیاق احمد

قسط نمبر 12

”ہاں! آپ بتائیے نا۔ تاکہ ہم آپ کے گھروں کو اطلاع دے سکیں۔“

”مجھے کچھ یاد نہیں آرہا کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتا ہوں۔ مجھے کن لوگوں نے زخمی کیا، کیوں کیا کچھ سمجھ میں نہیں رہا۔“

”اس کا مطلب ہے اس حادثے کا آپ کے دماغ پر بھی اثر ہے۔ اور آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ جب آپ کی حالت سنبھل جائے گی تو پھر سب کچھ یاد آجائے گا۔ کوئی بات نہیں، ہم اس وقت آپ سے باتیں کر لیں گے۔ بس ابھی صرف یہ ہے کہ ہم آپ کے گھر والوں کو اطلاع نہیں دے سکیں گے۔“ محمود جلدی جلدی ہوا۔

”گھر گھر گھر اودھاں پا آئیے۔ میں رحمانیہ محلے میں رہتا ہوں۔ گلی نمبر نو میں ستائیسواں مکان۔“ اس نے کہا۔

”وہ یہ رحمانیہ محلہ کہاں ہے۔ کیا دار الحکومت میں؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”تو در کہاں ہوگا۔ کیا میں دار الحکومت کے کسی ہسپتال میں نہیں ہوں۔“

”نہیں۔ آپ اس وقت شاہ پور میں ہیں۔“

”اودھا“ اس نے چمک کر کہا۔

”وراب آپ اپنا نام بھی بتادیں۔“

”مم... میں راجہیل ٹوٹی ہوں۔“

”شکریہ! اب ہم آپ کے گھر والوں کو اطلاع دینے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہم سیدھے وہیں جا رہے ہیں۔“

”کچھ بات ہے۔ کیا باہر میری حفاظت کا نظام ہے؟“

”نہیں۔ کیا آپ واقعی خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔“

”ہاں! ہو سکتا ہے، وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں۔“

”خیر ہم ڈکٹر صاحبان سے بات کرتے ہیں۔“

تینوں باہر نکلے اور ایمر جنسی وارڈ کے دفتر میں داخل ہو گئے

”آپ۔ آپ وہی تو ہیں جو اس زخمی کو لے کر آئے تھے۔ اور پولیس جنھیں پکڑ کر لے گئی تھی۔“

”جی ہاں! ہم سو فیصد وہی ہیں، پولیس غلط فہمی کی بنا پر پکڑ کر لے گئی تھی۔ آپ سے عرض یہ ہے کہ اس زخمی کی زندگی

خطرے میں ہے۔“

”کیا مطلب۔ کیا اس کی حالت پھر خراب ہو گئی ہے؟“

”جی نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے دشمن لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہی اسے گولیاں ماری ہیں، اب اس کا حیاں ہے کہ وہ لوگ اسے تلاش کرتے یہاں تک بھی آجائیں گے۔ اور ایک بار پھر اس پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ مطلب یہ کہ اس کے کمرے کے باہر پولیس کا سپروہونا چاہیے۔“

”مجھی بات ہے۔ میں پولیس اسٹیشن کو فون کیے دیتا ہوں، اور کچھ۔“

”جی ہاں، شکریہ۔ اب ہم اس کے گھر والوں کو اطلاع دیے جا رہے ہیں۔ وہی ہسپتال کے خراجات وغیرہ ادا کریں گے۔“

”ہوں اٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”کیا اس کے جسم سے گولیاں نکال لی گئی ہیں؟“

”ہاں۔ آپریشن کے ذریعے گولیاں نکال لی گئی ہیں، خون بہت بہہ گیا تھا، خون بھی دیا گیا ہے، اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“

”شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ اب ہمیں اجازت دیں۔“

”مجھی بات ہے۔“ ڈاکٹر نے ان سے ہاتھ ملایا اور وہ باہر نکل آئے۔

”اب دارالحکومت کس طرح پہنچیں۔ کسی گاڑی یا بس سے جائیں گے تو بہت وقت لگ جائے گا۔“

”تو پھر ٹیکسی ہی سے چلتے ہیں۔“ فرزانہ بولی۔

”ہائل لک لیک۔“

انہوں نے ایک ٹیکسی لی ورنہ وہ ہو گئے۔ دارالحکومت پہنچ کر انہوں نے سیدہ رحمانیہ محلے کا رخ کیا۔ گلی نمبر 9 اور اس میں مکان نمبر 27 تلاش کرنے میں انہیں کوئی وقت نہ ہوئی۔ ٹیکسی کو انہوں نے سڑک پر ہی رخصت کر دیا، کیونکہ اب وہ شہر میں تھے اور یہاں سے ہا سانی دوسری ٹیکسی پکڑ سکتے تھے۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور ایک نوجوان آدمی کی صورت نظر آئی۔

”راہیل ٹو جی۔ یہیں رہتے ہیں نا؟“

”ہاں، کیوں۔ کیا بات ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”انہیں کسی نے شدید زخمی کر دیا ہے۔ ہم نے انہیں شدید زخمی حالت میں شاہ پور کے ایک پرائیویٹ ہسپتال تک

پہنچایا ہے۔“

”وہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر اندر آ جائیے، تفصیل سے حالات سنائیے۔۔۔ تاکہ ہم انتظام کر کے روانہ ہوں۔“ اس نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

تینوں اس کے ساتھ ایک کمرے میں آ گئے۔ اسی وقت تیس نو جوان آدمی اور کمرے میں آ گئے۔  
”راجیل کو کسی نے رنجی کر دیا ہے۔“ بچنے نے انھیں بتایا۔

”وہ انہیں پہلے ہی اس بات کا خطرہ تھا۔“ تیس میں سے ایک بولا۔

”جی کیا مطلب۔ پہلے سے خطرہ تھا۔“ فرزانہ چونک کر بولی۔

”جی ہاں اس نے کچھ لوگوں کو پناہ دشمن بنایا تھا۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا، لیکن اس نے ہماری کسی ہی نہیں۔“

”کیا وہ آپ کے بھائی ہیں؟“

”ہاں ابو سے بھائی۔“

”ہم بہت دور سے آرہے ہیں، پہلے یہاں سے راجیل صاحب کو لے کر شاہ پور پہنچے۔ اب وہاں سے یہاں۔ ہمیں شام کی چائے تک نصیب نہیں ہوئی، نہ ہم نے اب تک رات کا کھانا کھایا، کیا آپ ہمیں کھانے کے بے کچھ دے سکتے ہیں۔“ فرزانہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

حمود اور فاروقی نے اس کی طرف حیرت اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ یہ تو خیر ٹھیک تھا کہ انھوں نے شام کی چائے تک نہیں پی تھی اور نہ رات کا کھانا نصیب ہوا تھا، لیکن اب تھوڑی دیر بعد وہ گھر پہنچنے ہی والے تھے، پھر ایسی صورت میں بھلانگوں سے کھانا، گلے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کس قدر رگری ہوئی حرکت فرزانہ سے سرزد ہوئی تھی اور پھر ان لوگوں کو تو انھوں نے ایک بُری خبر سنائی تھی۔ انھیں تو فوری طور پر شاہ پور کے لیے روانہ ہونا تھا۔۔۔ یہی وہ بے چارے انھیں کیا کھاتے پلاتے۔ ابھی وہ فرزانہ کو اچھی طرح گھور بھی نہیں پائے تھے کہ ان میں سے ایک نے کہا:

”الفسوس! اس وقت تو ہم آپ لوگوں کی کوئی بھی خدمت نہیں کر سکتے۔ یوں بھی ہمیں راجیل کی پریشانی ہے۔“

”اوہ! ٹھیک تو ہے۔ اچھا خیر اب ہم چلیں گے۔“ حمود جلدی سے بولا۔

”کم از کم آپ ہمیں چائے تو دے سکتے ہیں۔“ فرزانہ بھی جلدی سے بولی۔

”الفسوس! ہم اس وقت چائے پلانے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں بھئی۔ آؤ فرزانہ اب چلیں۔“ حمود نے حکماً کر کہا۔ اسے فرزانہ پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس قدر گھٹیا حرکت اس سے کبھی سرزد نہ ہوئی ہوگی۔

آخر وہ باہر نکل آئے اور باہر آتے ہی حمود فرزانہ پر اُلٹ پڑا:

”یہ تم نے کیا کیا فرزانہ! ہمارے سر شرم سے جھکا دیے تم نے۔“

”اس حد تک جھکا دیے کہ اب شاید ہی اوپر اٹھ سکیں گے۔“ فاروق نے منہ ہٹایا۔  
”وہو، یہ اس نے کیا کر دیا ہے۔“

”اچھا، کچھ کیا ہی نہیں تم نے، یہ تم اتنی بھوک کی سب سے ہو گئیں، ذرا دیر کے بے صبر نہیں کر سکیں، اب ہمیں گھر پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگے گی۔“ محمود نے بھٹا کر کہا۔  
”بہت دیر لگے گی۔“ فرزانہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں اور کیا فیکسی دوڑھائی کلو میٹر کا فاصلہ پانچ چھ گھنٹے میں ہی تو طے کرے گی۔“ فاروق بولا۔  
”فرزانہ، کہیں آج تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔“ محمود بولا۔

”دریہ تم چلتے چلتے رک کیوں گئی ہو، یا تو اتنی بھوک لگ رہی تھی، یا اب قدم بھی نہیں اٹھا رہیں۔“  
”بھوک شاید مر گئی۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”تنی جلدی مر بھی گئی، کما ہے۔“ فاروق حیرن ہو کر بولا۔

”ہاں! تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو میں اس مکان کے آس پاس ہی رہوں گی۔“  
”کیا مطلب؟“ محمود اور فاروق ایک ساتھ چونک کر بولے۔ (جاری ہے)



”میں نے اس مکان کے اندر کوئی ہلکی سی آواز نہیں سنی۔ نہ کسی عورت کی، نہ بچے کی۔ یہی دیکھنے کے لیے میں نے کھانا اور چائے مانگی تھی۔ مگر میں عورتیں ہوتیں تو ان کے لیے کھانا یا پائے پیش کرنا کچھ مشکل نہ ہوتا۔ لیکن اگر اس گھر میں صرف مرد حضرات ہی رہتے ہیں، تب پھر وہ کھانا کی ہونٹ سے کھاتے ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے، یہی بات ہو۔ تب پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا کسی گھر میں صرف مرد نہیں رہ سکتے۔“

”نہیں جس گھر میں پانچ مرد موجود ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک یا دو شادی شدہ ضرور ہونے چاہئیں۔ یا پھر نا کی ماں بہنیں وغیرہ ہونی چاہئیں۔ لیکن اس گھر میں ان پانچ مردوں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ اگرچہ یہ صرف میرا اندازہ ہے۔ یا محسوسات ہیں، جو غلط بھی ہو سکتے ہیں، تاہم میں ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

”آخر تم یہاں رک کر کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”یہ دیکھنا کہ ان میں سے کوئی شاد چور کے لیے رو نہ ہوتا ہے یا نہیں۔“

”اودا! محمود اور فاروق کے سوا سے ایک ساتھ نکلا۔ وہ فرزانہ کو گھورنے لگے۔ آخر محمود بولا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔ تم عقل میں ہم سے دو ہاتھ آگے ہو۔“

”کیا بات کرتے ہو محمود۔ صرف دو ہاتھ میں تو کہتا ہوں۔ یہ سو ہاتھ آگے ہے۔“

”بس، باتیں نہ بگھرو۔ اور یہاں کھڑے رہنا بھی مناسب نہیں۔ ہمیں کسی تاریک گوشے میں کھڑے ہو جانا چاہیے۔“ فرزانہ نے بھٹا کر کہا۔

دروہ ایک گوشے میں سرک آئے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا، لیکن اس مکان سے کوئی بھی باہر نہ نکلا۔

”اب کیا خیال ہے؟“ فرزانہ مسکرائی۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا شاد چور جانے کا قلعہ کوئی اور ہو۔“

”ہاں... یہی بات نظر آتی ہے۔“

”لیکن کیوں۔ رحیل ٹوٹی تو ان کا بھائی ہے۔ ہم انہیں اس کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع دے چکے ہیں، پھر آخر یہ لوگ کیوں نہیں گئے۔ اس قسم کے حالات میں تو لوگ سارے کام بھول جاتے ہیں اور چپتاں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔“

”تو پھر کیا خیال ہے۔ ہم پھر ان کا دروازہ کھٹکتا کریں۔“ فرزانہ بولی۔

”لیکن کہیں گے کیا؟“ محمود حیران ہو کر رہا۔

”کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی لیں گے۔“ ڈاؤن میرے ساتھ۔ ”یہ کہہ کر فرراند آگے بڑھی۔ دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہی آدمی نظر آیا۔ انھیں دیکھ کر وہ چونک اٹھا، چہرے پر الجھن کے آثار دوڑ گئے۔“

”کیوں بھیجی۔“ آپ سوگ پھر گئے۔“

”دراصل ہم راجیل صاحب کے بارے میں بہت پریشان ہیں، ایک بات بتانا آپ کو بھول گئے تھے وہ بعد میں یاد آئی تو پھر یہاں آگئے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ وہ بات آپ کو بتادیں۔“

”ضرور ضرور۔“ آپ نے بہت تکلیف کی، شکریہ بتائیے دو کیا بات ہے۔“ اس نے کہا۔

”راجیل صاحب نے کہا تھا وہ خطرے میں ہیں، چند دور ہسپتال بھی پہنچ سکتے ہیں۔“

”اوہ!“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”آپ میں سے ایک یاد دہائی تو اس وقت تک روانہ ہو بھی چکے ہوں گے۔“ فرراند بولی۔

”ہاں اسیرے دو بھائی جا چکے ہیں۔“

”لیکن انھیں یہ بات معلوم نہیں۔ پتا نہیں راجیل صاحب انھیں ہوش میں ملے ہیں یا نہیں۔ اور یہ بات انھیں بتا پاتے ہیں یا نہیں۔ اس سے بہتر یہی ہوگا کہ آپ میں سے ایک یاد دہا اور وہاں چلے جائیں۔ اس طرح ان کی حفاظت کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“

”ضرور ضرور کیوں نہیں، ہم بالکل ایسی ہی کریں گے۔“ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

وہ وہاں سے ہٹ آئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔

”ڈاؤن بھی، ذرا اس مکان کا ایک چکر لگالیں، لیکن ہم میں سے ایک دروازے کی طرف ہی رہے گا، تاکہ معلوم ہو کوئی ن میں سے کہیں جاتا ہے یا نہیں۔“ فرراند بولی۔

فاروق کو وہ ہیں چھوڑ کر فرراند اور محمود نے چکر لگایا، لیکن مکان سے نکلنے والا کوئی اور راستہ نظر نہ آیا۔

”اس کا مطلب ہے، اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس میں سے کوئی ایک بھی شاد پور نہیں گیا۔“ محمود نے پلٹتے ہوئے کہا۔

”بالکل یہی بات ہے اور میں یہاں رک کر یہی دیکھنا چاہتی تھی۔“

”اور اب کیا پروگرام ہے؟“

”ہم ایک اور گھنٹہ یہاں رکیں گے۔ ذرا دیکھیں تو سہی، اب بھی کوئی جاتا ہے یا نہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“

دونوں فاروق کے پاس پہنچ گئے۔ اسے بھی بتایا گیا کہ نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں، پھر ایک گھنٹہ اور گزر گیا، لیکن کوئی

بہی باہر نہ نکلا۔

”نہیں بھئی۔ ان لوگوں کا شاہ پور جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ شاید انھیں راحیل نوحی سے کوئی بھردی نہیں ہے۔ محمود تم ذرا دفتر فون کر کے اس مکان کے نمبر نوٹ کرادو۔ اب اس گھر کی باقاعدہ نگرانی بہت ضروری ہے۔“

”ہاں ایہ ٹھیک ہے۔“

محمود نے ایک پبلک فون بوتھ سے دفتر فون کیا اور اس کے پاس آگیا، آدھ گھنٹے بعد ہی ایک سادہ لباس وال شخص وہاں پہنچ گیا۔ انھوں نے اسے ہدایات دیں اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے تو ان کی امی نے انھیں بتایا۔

”تمہارے ابا جان تو تمہاری تلاش میں شاہ پور گئے ہوئے ہیں۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔“

”جب ہم بھی یہاں ٹھہر کر کیا کریں گے۔ کیوں نہ کھانا کھا کر پھر شاہ پور کے لیے روانہ ہو جائیں۔“ فرزانہ نے فوراً کہا۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“

”تو یہ ہے۔ ابھی بھی کیا سرگرمی۔ اتنی بھگ دوڑ کے بعد گھر پہنچے اور اب پھر جا رہے ہو۔“ بیگم جمشید نے بھلا کر کہا۔

”بات دراصل یہ ہے می جان کہ ایک شخص کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہم اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ خود اس شخص کے بھائی اس کی جان بچانے کے لیے کوئی کوشش کرنے کو تیار نہیں ہیں۔“

”خیر... تم چالو... تمہارا کام۔“

انھوں نے کھانا کھایا اور ایک بار پھر شاہ پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ محلے کا سربراہ بھی تک ن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ کوئی بہت گہرا چکر ہو۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”ایہ تو ہمیں ہر کیس میں معلوم ہوتا ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”دھت تیرے کی۔ جواب دینے کے لیے ٹکے رہتے ہو۔“ محمود نے تھوڑا کران پر ہاتھ مارا۔

”اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا تم ران پر ہاتھ مارنے کے لیے ٹکے نہیں رہتے۔ کیا فرزانہ جیسے بھینے پر ٹکی نہیں رہتی۔ اور تو اور ای جان کیا کھانا گرم کرنے پر ٹکی نہیں راتیں اور ابا جاں کیا بھرموں کے خلاف دن رات ایک کرنے پر ٹکے نہیں رہتے۔“ فاروق کہتا جا رہا تھا کہ محمود گھبرا اٹھا۔

”بس بس۔ اتنا ہی کافی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ ایک دہر پھر ہسپتال کی طرف پڑھ رہے تھے۔

(جاری ہے)

انسپکٹر جمشید کے اندر داخل ہوتے ہی وہ ڈاکٹر کی طرح اچھلا پیسے تو اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر غصے کے ساتھ ہی اس نے چیخ کر کہا

”کون ہو تم اور اندر کیوں داخل ہوئے؟“

”اس کا جو ب تو میں بعد میں دوں گا، پہلے تم بتاؤ یہ تم کیا کر رہے تھے؟“

”کیا کر رہا تھا میں مریض کو انکشن لگا رہا تھا۔“ اس نے بھڑک کر کہا۔

”جھوٹ بولتے ہو تم اس کا گلا گھونٹ رہے تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، تالے کے سوراخ میں سے دیکھو، بھی تک اس کا سانس ہی نہیں ہو سکا تم کون ہو جلدی بتاؤ۔“

”ضرور تمہارا دماغ چل گیا ہے میں ہسپتال کا ڈاکٹر ہوں اور مریض کو انکشن لگا رہا تھا تم نے تالے کے سوراخ میں سے غلط دیکھا تھا میں نے اس کے گلے کے گرد سے کپڑے ضرور ہٹائے تھے تاکہ اسے سانس لینے میں دقت نہ ہو۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”غلط کہتے ہو جھوٹ بولتے ہو تم اس کا گلا دبانے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے خیر تم یوں کر دو کہ ہاتھ اوپر اٹھا دو تمہیں گرفتار کرنا ہو گا۔“

یہ کہتے ہوئے انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا، ارادہ تھا پستوں نکالنے کا، لیکن اس سے پیسے ہی وہ ڈاکٹر ہسپتال نکال چکا تھا۔ اس نے اندھا دھند انداز میں فائر جھونک مارا، فائر کی آواز گونج اٹھی انسپکٹر جمشید منہ کے بل گرے۔ ن کے پیچھے کھڑے، ایس پی منظور اور انسپکٹر سجاد بھی دھڑم سے گرے۔ انسپکٹر جمشید لڑھکتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ گئے اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکا اس کے دونوں پیسے اس کے سینے پر پڑے، وہ دوسری طرف اٹھ گیا، لیکن ’للتے‘ للتے بھی فائر جھونک مارا اس بار گوی انسپکٹر جمشید کے سر پر سے گزر گئی اور انسپکٹر سجاد کے شانے کو چھوئی نکل گئی اس نے ایک چیخ ماری اور دھڑم سے گرا، کیونکہ اس وقت تک وہ دونوں بھی اٹھ چکے تھے۔

ساتھ ہی انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ نفلی ڈاکٹر بوکھلا گیا اس نے دروازے کی طرف ایک چھلانگ لگائی، لیکن انسپکٹر جمشید نے ٹانگ آگے کر دی وہ دھڑام سے گرا، گرتے ہی پھر اٹھا اور دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ انسپکٹر جمشید نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگائی۔ گویاں چلنے کی آواز سن کر دوڑ کر آنے والے لوگ کافی کی طرح چھٹ گئے۔ اور انھیں رستہ دے دیا۔ چانک ایک فائر ہوا، نفلی ڈاکٹر کے منہ سے ایک دس دوڑ چیخ نکلی

اور وہ برآمدے میں گر کر تر پنے گا۔ انپکنز جشیہ نے فوری طور پر احاذہ مگانے کی کوشش کی کہ گولی کس طرف سے آئی، لیکن کچھ جان چل سکا نہ ہی انھوں نے کسی کو بھاگتے دیکھا۔ گویا جس نے بھی نقلی ڈاکٹر کا کام تمام کیا تھا، اس نے پورے اطمینان سے یہ کام کیا تھا۔

”یس پی صاحب، فوراً دروازے پر پہنچے انپکنز سجاد آپ بچھنے دروازے پر تلاشی کے بغیر کسی کو باہر نہ جانے دیا جائے، قاتل کے پاس ہستوں موجود ہے۔“

ایس پی منظور اور انپکنز سجاد دوڑ پڑے۔ انپکنز جشیہ نے نقلی ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر دیکھا، وہ دم توڑ چکا تھا۔ وہ وہاں پلٹے اور زخمی کے کمرے میں پہنچے۔ ایک ڈاکٹر اس کا سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے کامیابی بھی حاصل ہو چکی تھی۔

”یہ بے صرف سب ہوش ہے۔ سانس ٹھیک طرح سے رہا ہے، جلد ہوش میں آجائے گا۔“

”بہت خوب‘ یہ جس قدر جلد ہوش میں آجائے، بہتر ہے۔“ وہ بولے اور یک کرسی پر بیٹھ گئے۔

ادھر ہسپتال میں موجود دوگ بدحواسی کے عالم میں دروازوں پر نوٹ پڑے تھے، اور جلد سے جلد باہر نکل جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایس پی منظور اور انپکنز سجاد کو ان لوگوں کی تلاشی لینے کے سلسلے میں کافی وقت پیش آ رہی تھی، کیونکہ ان کے پاس، تحت عمل نہیں تھا۔ آخر پریس موقع پر پہنچ گئی۔ شاید ہسپتال کے ڈاکٹر نے فون کیا تھا اس میں وہ سب انپکنز بھی تھے جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ترقی دی گئی تھی۔ اس نے آتے ہی، ایس پی منظور اور انپکنز سجاد کی مدد شروع کر دی، یہاں تک کہ مریضوں کے علاوہ ہسپتال میں جتنے بھی لوگ تھے سب چلے گئے، لیکن ہسپتال کسی کے پاس سے برآمد نہ ہو۔ کاشیوں کو دروازوں پر چھوڑ کر ایس پی منظور اور انپکنز سجاد زخمی کے کمرے میں پہنچے

”کیوں جناب... کیا رہا؟“

”ہسپتال تو کسی کے پاس سے بھی برآمد نہیں ہوا۔“

”ہو۔ اس کا مطلب ہے اس نے قاتل کرنے کے بعد ہسپتال پھینک دیا ہوگا۔ وہ ضرور ہسپتال کے باغیچے میں

یا کسی کوڑے کے ڈرام میں پڑا ہوگا۔“

”وہ ہاں۔ اس کے علاوہ بعد کیا ہو سکتا ہے، میں ابھی تلاش کرتا ہوں۔“

تین اسی وقت کسی نے سرسراہٹ آوار میں کہا:

”ملک دلیر آ رہے ہیں۔“

ایس پی منظور اور انپکنز سجاد کے رنگ اڑ گئے۔ انپکنز جشیہ نے یہ بات صاف محسوس کی

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنا کام کریں گے۔“

”چھا“ ایس بی منکون نے کہا ورا سپکٹر سجاد کے ساتھ چلا گیا۔ اسی وقت یک گرج در آوار اس کے کانوں سے نکرائی

”یہ کیا تم دونوں یہاں کس سبب سے نظر آرہے ہو، تمہیں تو طر زمت سے نکال دیا گیا ہے۔“

”اسپکٹر جمشید ہمیں اپنے ساتھ لے کر یہاں آگئے تھے۔“ ایس بی منکون نے جواب دیا۔

”وہ کون ہوتے ہیں تمہیں ڈیوٹی دینے والے۔“

”نھوں نے ہمیں ڈیوٹی ہرگز نہیں دی۔“ اسپکٹر سجاد نے فوراً کہا۔

”کہاں ہیں وہ۔“

”اس کمرے میں جس میں زخمی کور کھا گیا ہے۔“

”ملک دلیر کے قدم اس کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔“

”اسپکٹر جمشید... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ایک زخمی شخص کی حفاظت۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”آپ کی ڈیوٹی جہاں ہے، آپ وہاں جائیں۔ اس شہر کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔“

”جی بہتر چلا جاتا ہوں۔“ انھوں نے اٹھے بغیر کہا۔

”تو چلے جائے نا... بیٹھے کیوں ہیں۔“

”میں اس زخمی کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ تاکہ معلوم ہو سکے آخر یہ کیا چکر ہے۔ لوگ اس کی

جان کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔“

”یہ بات ہم جان لیں گے آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔“

”شاید آپ نہیں جانتے اسے میرے تین بچے جنگل سے اٹھا کر مائے تھے۔“ ورا ای سب سے میں اس پر آپ کی کار

کی چوری کا الزام صاف کیا گیا ہے۔ ان پر اس الزام کو دھوا، تا میر فرض ہے، اسی سبب سے میں، میں اس زخمی کا بیان لینا

چاہتا ہوں۔“

”یہ تاہم کام ہے۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

”افسوس میں نہیں جاسکتا۔“

اسپکٹر جمشید بولے۔

”کیا کہا۔ آپ نہیں جاسکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”میں اس شخص سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ جلد ہوش میں آئے گا۔“

”جب کہ میں چاہتا ہوں، آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”چھا میں دیکھتا ہوں۔ یہ کیسے نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہ کر ملک دلیر کمرے سے نکل گیا۔

ہسپتال کی نقار پر ایک سنسنی خیز خبر دوڑ گئی۔ یوں لگا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ آخر ملک دلیر، سب اسپکٹر ورا کچھ

کانشیوں کو ساتھ لے کر پھر اس کمرے میں داخل ہو اور دھاڑ کر بولا

”اسپکٹر اس شخص کو ہسپتال سے باہر نکال دو۔“

”جج۔ جی۔“ سب اسپکٹر کانپ اٹھا۔

(جاری ہے)

”تم نے سنا نہیں، میں نے کہا ہے، اسے باہر نکال دو۔“

”انسپکٹر صاحب، مہربانی فرما کر آپ باہر چلے جائیے۔“

”آخر کیوں، ان صاحب کا کیا حرج ہے، اگر میں اس رُخمی کے پاس میٹھا ہوں۔“

”یہ میں کچھ نہیں جانتا، میں ملک صاحب کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں۔“

”لیکن میں آپ کے احکامات، نہ نئے پر مجبور نہیں ہوں۔“ انسپکٹر جمشید نے کچھ دیر بعد سے بولے۔

”سب انسپکٹرز نے سوالیہ نظروں سے ملک دلیر کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو

”اب کیا کیا جائے جناب۔“

”دیکھ کیا رہے ہو، انھیں، اٹھا کر ہسپتال سے باہر چھوڑ دو۔“ ملک دلیر گرجا۔

سب انسپکٹر اپنے کانشیبوں کے ساتھ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا، باقی تمام لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے سب سے زیادہ ردی حالت اس پی منظور اور انسپکٹر جمشید کی تھی، ان کی حالت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کانٹو بدن میں بیٹھیں۔

”خبردار انسپکٹر صاحب، مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے اس اجارت نامے کو دیکھ لیں۔“ انسپکٹر جمشید نے کوٹ کی

اندرونی جیب سے اجارت نامہ نکالا، اس کے سامنے لہرایا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور کاغذ اس کے ہاتھ سے بے لیا۔

جو فحشی اس نے اجازت نامہ پڑھا، اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا، تھر تھر کانپتی آواز میں ملک دلیر سے بولا،

”مس، سر، سر یہ، یہ دیکھیے۔“

”یہ کیا ہے۔“ ملک دلیر نے منہ بنا کر کہا، اور پھر کاغذ لے کر پڑھا، اس کا رنگ بھی اڑ گیا، چہرے پر شدید تھلاہٹ

کے آثار نمودار ہو گئے، پھر گرج کر بولا

”میں ابھی دیکھ بیٹا ہوں اس اجارت نامے کو، ڈاکٹر صاحب فون کہاں ہے؟“ اس نے پاس کھڑے ڈاکٹر کی

طرف دیکھا۔

”اس طرف جناب۔“ ڈاکٹر گھبرا کر بولا۔

ملک دلیر فون کی طرف چلا گیا، انسپکٹر جمشید رُخمی کی طرف متوجہ ہو گئے، یمن اسی لمحے اس نے آنکھیں کھول

دیں، انسپکٹر جمشید اس پر جھک گئے



”مسٹر تمہارا کیا نام ہے تمہیں کس نے زخمی کیا اور کس جگہ کیا تم کچھ بتا سکتے ہو؟“

”نک۔ کیا ابھی تک میرے ساتھی نہیں آئے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہاں تمہارا کوئی واقف ابھی تک نہیں پہنچا۔ آخر یہ سب کیا چکر ہے۔“

”میں اسی وقت ملک دلیر کی دعا سنائی دی

”انسپکٹر جمشید۔ گور صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ انھوں نے بھنا کر دروازے کی طرف دیکھا، پھر واپس پیٹھ کی طرف مڑے۔

”آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ کوئی اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کر پائے۔“

”اچھا۔ آپ لکڑہ کریں۔“ اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید ہاتھ انداز میں چلتے فون کی طرف بڑھے۔ اس وقت بھی کی نظریں پر جمی تھیں۔ سلسلی فیصلحات تھے۔ نوگوں کے دس دھک دھک کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور بولے

”ہیس سر! انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔“

”بھئی جمشید صاحب۔ ملک دلیر صاحب جو کہتے ہیں، وہ کریں۔“

”جی کیا مطلب؟“ انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

”میں نے یہی کہا ہے۔ جو وہ کہتے ہیں، وہ کریں۔“

”لیکن سر! میں ایک معاملے کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اور وہ اس تفتیش میں دخل اندازی کر رہے ہیں، جب کہ انھیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں، میں پیچھے کس طرح ہٹ سکتا ہوں، جب کہ میرے پاس صدر صاحب کا جازت نامہ موجود ہے کہ میں ملک کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔“

”میں جانتا ہوں جمشید تمہارے پاس صدر صاحب کا اجازت نامہ ہے۔ لیکن میں درخواست کروں گا۔ اس وقت وہی کرو، جو ملک دلیر کہتا ہے۔“

”سوری سر! میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید۔“

”ہیس سر میں مجبور ہوں۔ اس وقت میں جو کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی بہت اہمیت ہے۔ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ہاں، ایک صورت میں ضرور اس معاملے سے ہاتھ اٹھ سکتا ہوں۔ یہ کہ صدر صاحب میرا یہ جازت نامہ کنسل کر دیں۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ریسیور میز پر رکھ دیا اور کمرے کی طرف مڑ گئے۔

ملک دلیر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا چار ہاتھ اس نے بھٹا کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔  
”ہیلو طوائف صاحبہ.. کیا رہا؟“

”انسپکٹر جمشید کسی طرح بھی، نئے پر تیار نہیں۔“

”پھر... اب میں کیا کروں۔“

”کیا انھیں ہسپتال سے نکالنا ضروری ہے۔“

”نہیں، لیکن اب یہ میری سن کا مسئلہ بن گیا ہے۔“

”تب پھر آپ صدر صاحب سے رابطہ قائم کریں، وہ اس وقت اپنی رہائش گاہ پر موجود ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میں جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ملک دلیر نے سلسلہ کاٹا اور صدر کے نمبر گھم نے لگا۔ آخر چند رہ منٹ بعد سلسلہ قائم ہوا۔  
دھر انسپکٹر جمشید رخمی کا بیان لکھ رہے تھے، وہ جلدی جلدی بول رہا تھا، اور وہ ٹوٹ کر رہے تھے، انھوں نے رخمی کو یہ احساس دلایا تھا کہ لکھات بہت نازک ہیں، اسے چاہیے کہ جلد از جلد بیان لکھو دے۔

دوسری طرف سلسلہ گیا، ملک دلیر نے بات چیت شروع کی، آخر ایک بار پھر اس نے گرج دار آواز میں کہا  
”انسپکٹر جمشید، آپ کو صدر صاحب فون پر بنا رہے ہیں۔“

بیان کا سلسلہ درمیان میں چھوڑ کر انھیں اٹھنا پڑا، ریسیور اٹھاتے ہوئے انھوں نے کہا

”نیس سر، آپ کا خادم بول رہا ہوں۔“

”جمشید، یہ آپ شاہ پور کس طرح پہنچ گئے، آپ تو میرے محلے کی تقیتش کر رہے تھے۔“

”یہ ایک بہت اچھا ہوا معاملہ ہے سر، ابھی حاضر ہو کر بتاؤں گا۔“

”ملک دلیر کا کیا چکر ہے؟“

”ہم اس وقت ایک ہسپتال میں موجود ہیں، یہاں ایک رخمی کو محمود، فاروق اور فردوس نے داخل کر دیا ہے، میں اس

کا بیان لینا چاہتا ہوں، لیکن ملک دلیر صاحب بیان لینے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔“

”لیکن کیوں، وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا سر۔“

”کیا سمجھوتے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔“

”بیان لینا جانا بہت ضروری ہے سر، اس کے پیچھے لوگ موت کے سائے کی طرح لگے ہیں، آخر کیوں میں یہی

چاہتا چاہتا ہوں، لہذا بیان لینا بہت ضروری ہے، لیکن اگر آپ حکم فرمائیں گے تو پھر میں بیان نہیں لوں گا، ہاں، اس

صورت میں آپ کو میرا جازت نامہ کیمنسل کرنا ہوگا۔“

”حمشید یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ صدر صاحب کے لہجے میں ناگواری دور تھی۔

”کیا کروں سر، مجبور ہوں۔“ انھوں نے کہا۔

”شاید آپ نہیں جانتے ملک دہلیز کون ہے۔“

”جی ہاں، یہ ٹھیک ہے، میں نہیں جانتا۔“ انھوں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں، ہمارا ملک جس بڑے ملک سے آج کل فوجی امداد حاصل کر رہا ہے اس ملک کے صدر سے

ملک دہلیز کے خاص تعلقات ہیں۔ کسی زمانے میں وہ کھاس فیلور ہے ہیں، ورا ب بھی ان میں گہری دوستی ہے

ملک دہلیز کا ایک اشارہ ہمیں مشکلات میں ڈال سکتا ہے۔“

”جی ہاں“

انسپیکٹر جمشید ستانے میں آگئے، ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہو، صدر صاحب کے

اظہار کا صاف مطلب یہ تھا کہ ملک دہلیز کے سامنے وہ بھی مجبور ہیں اور یہ ایک ایسا انکشاف تھا کہ انسپیکٹر جمشید جیسا آدمی

چکرا کر رہ گیا۔

ان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

(جاری ہے)

چند لمحوں کے لیے دونوں طرف خاموشی طاری رہی، آخر صدر صاحب کی آواز بھری

”سیو جمشید! آپ خاموش ہو گئے، میں جانتا ہوں، آپ کو یہ بات سن کر بہت دھچکا پہنچی ہوگا، لیکن جمشید آج کل کے بین الاقوامی حالات تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بڑی طاقتیں کس

طرح چھوٹے ملکوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں اور کس طرح

ایک دوسرے کو تڑا دیتی رہتی ہیں۔ حکومتوں کے تختے اٹھاتی رہتی ہیں۔ مناجات میں ملک دلیمر سے دشمنی مول لینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس لیے میں درخواست کرتا ہوں، آپ اس وقت درگزر سے کام لیں۔“ یہاں تک کہ صدر صاحب خاموش ہو گئے۔

”ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گیا۔ وہی ہوگا جو آپ نے فرمایا۔“ انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

”شکریہ جمشید! آپ بہت سمجھدار ہیں۔ مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ ملک دلیمر ایک جذباتی ہے۔ بدوجہ بات پر اڑ جاتا ہے، مجھے اس کا احساس ابھی طرح ہے، لیکن ملک اور قوم کی بہتری ہی میں ہے کہ اسے نہ چھیڑ جائے۔ چھیڑے جانے کی صورت میں وہ ہمارے لیے زخمی سانپ کی طرح خطرناک ثابت ہوگا۔“

”مم... میں سمجھ گیا سر!“ وہ بولے۔

”مہربانی فرما کر آپ ریسیور ملک دلیمر کو دے دیں۔“

”اوکے سر!“ انھوں نے کہا اور ریسیور ملک دلیمر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے

”صدر صاحب سے بات کر لیں۔“

”تو میں جیت گیا تا۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں، جیت آپ کی ہوئی ہے۔“ اسپیکر جمشید مسکرائے۔

لوگوں کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی، کچھ چہروں پر حد درجے سکون بھی نظر آیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے ہی ملک دلیمر کی فتح کے امیدوار تھے۔ اور ملک دلیمر فون پر صدر مملکت سے بات کر رہے تھے

”بہت بہتر جناب۔ میں خیال رکھوں گا۔“ ان کی آواز سنائی دی اور پھر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ من کی طرف مڑے اور نرم آواز میں بولے

”صدر صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بھی بہت وطن پرست ہیں اور ہر وقت ملک اور قوم کے کام آنے والے ہیں،

مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ ضد کر بیٹھا، امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔ لہذا اب آپ جا سکتے ہیں۔“

سب نے یہ الفاظ سنے، انسپکٹر جمشید نے سب پر ایک نظر ڈالی اور پھر سکون آواز میں بولے

”رُخمی کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہوتا میں نے صاف دیکھا ہے، یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے۔ اگر آپ مجھے بات کرنے کی جارت دے دیں تو یہ آپ کی فراخ دل ہوگی، ہم دونوں کی ضد کے معاملے میں فتح پہلے ہی آپ کی ہو چکی ہے، یہ جارت دے کر آپ مجھ پر ایک در فتح حاصل کر لیں گے۔ کیا خیال ہے، اجازت ہے۔“

”انسپکٹر جمشید جارت دینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اب یہ میری آن کا مسئلہ بن چکا ہے۔ آپ اس موقع پر رُخمی سے بات کیے بغیر ہی جائیں گے۔ ہاں، کل یا پھر کسی وقت۔“ کر اس سے بات کر لیجیے گا، میں یہاں ہوں گا ہی نہیں۔“

”لیکن جناب۔ اس وقت تک شاید رُخمی رندہ نہ ملے، کیونکہ کچھ لوگ اس کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں، وہ ہر قیمت پر اسے جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔“

”فکر نہ کریں، اس کی حفاظت کا انتظام میں کیے دیتا ہوں۔“

”بہت اچھا۔ آپ کی مرضی۔ اب میں چلتا ہوں۔“

”اب آپ کو جانے کی ضرورت نہیں، معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“

ایک آوار بھری۔ سب نے چونک کر دھرا دھرا دیکھا، سب سے زیادہ حیرت انسپکٹر جمشید کے چہرے پر نظر آئی۔ کیونکہ آواز محمود کی تھی۔ پھر محمود، فاروق اور مرزا نے مجھے میں سے نکل کر ان کے سامنے پہنچی گئے۔ انھیں دیکھ کر ملک دھیر کے چہرے پر ناخوش گو رآغا نمودار ہو گئے۔

”وہ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں بھان اٹھ۔“ انھوں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”تم نے کیا کہا محمود۔“ انسپکٹر جمشید حیرت ہو کر بولے۔

”اب آپ کو یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں، اور نہ کوئی جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔“ فاروق نے سرد آواز میں کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے، صدر صاحب انسپکٹر جمشید کو حکم دے چکے ہیں۔“ ملک دھیر گرجا۔

”ضرور دے چکے ہیں، لیکن مشکل ایک اور ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”مشکل ایک اور ہے۔ کیا مطلب۔ مشکل ایک اور ہو یا کئی در ہوں، مجھے اس سے کیا۔ تم لوگوں کو فوری طور پر ہسپتال سے لٹکا ہوگا۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”دیکھ جائے گا۔ ہسپتال سے کون لٹکا ہے۔“

"انسپکٹر یہ لوگ صدر صاحب کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، انہیں گرفتار کر لیا جائے۔" ملک دھیر نے حکم دیا۔

"بہت بہتر سر۔" سب انسپکٹر نے کہا اور آگے بڑھا۔

"انسپکٹر صاحب بھی ہمیں گرفتار نہیں کر سکتے۔" محمود بولا۔

"محمود کچھ کہو بھی۔" انسپکٹر جمشید بے تابانہ لہجے میں بولے۔

"جب ہم ہسپتال میں داخل ہوئے۔" آپ میں اور ملک دھیر میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی ساری بات کو بھنپا اور پھر زخمی کے کمرے کی طرف کھسک گئے۔ اس وقت سب ہی مقابلہ دیکھنے میں لگے ہوئے تھے، زخمی بے چارہ کمرے میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی اور بول اٹھا۔

"شکر ہے۔ آپ آگئے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مجھے ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی اور کی جا چکی ہے۔ اس لیے میری بات سن لیں۔

مذہب کو کیا چاہیے، دو تکلیفیں، لہذا میں نے جلدی سے کہا۔

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں، آپ سنا دیجئے ہم ہو کر سن رہے ہیں۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں۔ میری بات نیپ کر لیا جائے۔" زخمی بولا۔

"لیکن ہمارے پاس اس وقت نیپ کرے کا کوئی سامان نہیں ہے۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں اس سے کہا۔

اس پر اس نے اپنی ہاتھوں کی جیب سے ایک بھیجی نیپ ریکارڈ نکال کر ہماری طرف بڑھا دیا، اس میں کیسٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ اور بولا۔

"مجھے پتہ ہی کچھ اندازہ تھا کہ ایسا موقع آ سکتا ہے، اس لیے میں نے یہ جیب میں تیار کر لیا تھا۔ سب مہربانی فرما کر میری بات غور سے سنیے۔"

"یہ کہہ کر اس نے اپنا بیان سنا ڈالا۔ اس کے بیان کی روشنی میں ہی تو ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اب ہسپتال سے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"بات ابھی تک پتے نہیں پڑی۔" حوزہ زخمی نے کیا بیان دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بھڑا اٹھے۔

"بہت اہم۔ بلکہ بہت ہی اہم۔" فاروق نے شوخ انداز میں کہا۔

"اور کیا آپ دیکھ نہیں رہے۔" فرارانہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا دیکھ نہیں رہے۔" وہ بولے۔

"یہ کہہ کر ہماری باتیں سن کر سنسنی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سب لوگ کہتے کہتے کہ ہم میں کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے

ایسے خاص طور پر ملک و قوم کے لئے جو کہتے ہیں کہ "میں نے اپنے ملک کو برباد کیا۔" (جاری ہے)

زخمی

اشتیاق احمد

آخری قسط

”جی ہاں... ملاحظہ فرمائیں... ان کا چہرہ۔“ فاروق نے کہا۔

انسپکٹر جمشید اور دوسرے ملک دلیر کی طرف گھوم گئے... اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

”آپ... آپ کو کیا ہوا ملک صاحب؟“ سب انسپکٹر نے بوکھلا کر کہا۔

”ان کا ہارٹ فیل ہونے کے قریب ہے... جلدی سے ایسیو لینس منگالیں... مہ... مگر نہیں... ایسیو لینس کی یہاں

کیا ضرورت، ہم تو پہلے ہی ایک عدد ہسپتال میں موجود ہیں۔“ فاروق بولا۔

ملک دلیر اب بھی کچھ نہ بولا... سب کو اس کی خاموشی نے حیرت زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔

”آف خدا... میں سمجھ گیا... تو یہ ساری سازش ملک دلیر کی تھی... صدر صاحب پر قاتلانہ حملہ انھوں نے کرایا تھا...

کمرے میں پڑا ہوا زخمی دراصل ان کا آدمی ہے۔“

”جی ہاں، آپ ٹھیک سمجھے... زخمی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس سازش میں اکرام خان اور ڈاکٹر ہدانی بھی برابر کے

شریک ہیں اور انھیں بڑے بڑے مہموں کے لالچ دیے گئے ہیں... بلکہ لوگوں سے بھرے ہوئے بریف کیس تو پہلے ہی

دیے جا چکے ہیں... اس لوگوں سے بھرے ہوئے بریف کیس کی وجہ سے زخمی کے باقی چار ساتھی اس کی خبر گیری کے لیے

ہسپتال نہیں پہنچے اور نہ اسے بچانے کی انھوں نے کوئی کوشش کی... یہی چیز محسوس کر کے وہ بیان دینے پر آمادہ ہو گیا...

اس کے چاروں ساتھیوں نے سوچا... زخمی ہسپتال میں مر گیا تو اس کا حصہ بھی وہ آپس میں تقسیم کر لیں گے... اس لیے

اسے بچانے کی کیا ضرورت۔“ محمود کہتا چلا گیا۔

”اور تم اس کا بیان شیپ بھی کر چکے ہو۔“ انسپکٹر جمشید نے جوش لہجے میں بولے۔

”جی ہاں... بالکل...“

چیک بھی کر چکے ہیں کہ شیپ ہو گیا ہے یا نہیں۔“

”دیری گنڈ۔“ انھوں نے خوش ہو کر کہا اور ملک دلیر کی طرف بڑھے:

”مسٹر دلیر... اب کیا کہتے ہیں آپ؟“

”یہ کہ تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“

اس لمحے ملک دلیر کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

”اور تم وہ شیپ میرے حوالے کر دو۔“



”معاف کیجیے گا ملک صاحب۔۔۔ اب اس ٹیپ کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔۔۔ اتنے بہت سے لوگ اس بیان کو سن چکے ہیں، دوسرے یہ کہ یہ بیان سننے کے بعد ہی آپ نے ہم پر پستول اتارتا۔۔۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دشمنی کا بیان سونی صدر درست ہے۔۔۔ اب آپ بچ نہیں سکتے۔۔۔ اب تو صدر صاحب بھی آپ کی سفارش نہیں کر سکتے۔۔۔ جب انھیں معلوم ہوگا کہ یہ سب کیا دھڑا تو آپ کا ہے تو پھر آپ کے بارے میں ان کا حکم کچھ اور ہی ہوگا۔۔۔ اس لیے پستول پھینک دیں اور خود کو قانون کے حوالے کر دیں گے، اس وقت آپ کے لیے اس سے بہتر مشورہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

”میں نے کہا ہے، سب لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔۔۔ میں تم سب کو ختم کر دوں گا۔۔۔ اور ہسپتال کو آگ لگوادوں گا۔۔۔ نہ رہے گا ہانس اور نہ بیجے گی ہانسری۔۔۔ کل کے اخبارات میں خبر ہوگی کہ ہسپتال میں اچانک آگ لگ گئی اور بے شمار لوگ جل کر راکھ ہو گئے۔۔۔ کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ ایسا کس طرح ہوا۔۔۔ اور میں ملک دلیر کا ملک دلیر ہی رہوں گا۔“ اس نے فطریہ لہجے میں کہا۔

”تم بھول رہے ہو۔۔۔ تمہارے پستول میں اتنی گولیاں نہیں ہیں کہ سب کو ختم کر سکو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”سب انسپکٹر اپنا پستول بھر کر مجھے دے گا۔۔۔ اور میرا خالی پستول مجھ سے لے کر بھر کر دے گا۔“ اس نے کہا۔

”کیوں بھئی۔۔۔ کیا تم بھی اس کا ساتھ دو گے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔۔۔ میں ایک بھی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگ سکتا۔“ اس نے کانپ کر کہا۔

”تب پھر تم بھی ان کے ساتھ جل مرو گے۔۔۔ میرے پاس دوسرے طریقے ہیں۔“

”بس ابا جان۔۔۔ اب اس کا کھیل ختم ہو گیا۔۔۔ ہم اس کے منہ سے یہی الفاظ سنا چاہتے تھے۔“ محمود خوش ہو کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جب ہم ہسپتال پہنچے اور آپ دونوں کے مقابلے کا حال جانا تو دشمنی کے کمرے کی طرف کھسک لیے، لیکن یہ دیکھ کر ہماری مٹی گم ہو گئی کہ دشمنی کے سینے میں ایک خنجر اُتار دیا گیا تھا اور دوسرا چکا تھا۔“

”کیا کہا۔۔۔ مر چکا تھا۔“ انسپکٹر جمشید جلا اٹھے۔

”جی ہاں۔۔۔ کوئی اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔۔۔ ہمیں بہت افسوس ہوا۔۔۔ ہم نے اس کی تلاشی لی تو جیب سے ایک جیبی ٹیپ ریکارڈر نکلا، لیکن اس میں کچھ بھی ٹیپ کیا ہوا نہیں تھا۔۔۔ ہم پھر مجھے میں آ شامل ہوئے اور آپ کا مقابلہ سننے لگے۔۔۔ اور پھر اس وقت ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ملک دلیر دراصل آپ کو دشمنی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور بات کوئی نہیں۔۔۔ یہ ضد اور آن کا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ مسئلہ خون کا ہے۔۔۔ کہ اگر آپ نے دشمنی کا بیان لے لیا تو معاملہ خراب

ہو جائے گا... دوسرے یہ ڈراما رچانے کا مطلب یہ تھا کہ ملک صاحب کے آدمی کو موقع مل جائے اور سب کی نظروں سے بچ کر زخمی کو موت کے گھاٹ اتار دے... یہ تھی کل کہانی... لہذا ملک دلیر کے الفاظ اب ہم نے ٹیپ کر لیے ہیں... ہمیں افسوس ہے، پہلے ہم نے جھوٹ بولا تھا، لیکن مجبوری تھی... ملک دلیر سے جرم کا اعتراف کرانے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا... لہذا اب ہم اپنا جھوٹ واپس لیتے ہیں... یوں بھی جھوٹ ملک اور قوم کی بہتری کے لیے بولا گیا ہے... اُمید ہے اللہ تعالیٰ بھی ہمیں معاف فرمائیں گے... آمین... تم آمین۔“

”اپنا جھوٹ واپس لیتے ہیں... لیجیے... اب جھوٹ بھی واپس لیا جائے گا... باقی کیا رہ جائے گا۔“ فاروق نے منہ ہٹایا۔

”میرا پروگرام اب بھی اپنی جگہ پر ہے... میں تم لوگوں کو گولیوں کو نشانہ بنا کر ہسپتال کو آگ لگا دوں گا۔“ ملک دلیر بولا۔

”اور میرا سوال بھی اپنی جگہ پر ہے... آپ اتنی گولیاں کہاں سے لائیں گے؟“  
 ”پر وائیس... صرف تم لوگوں کو ٹھکانے لگاؤں گا... باقی سب کو دھکیل کر کسی کمرے میں بند کر دوں گا۔“ اس نے گرج کر کہا۔

میں اسی وقت اس کی کمر پر کوئی چیز پوری طاقت سے ٹکرائی... اور وہ اونٹن سے منہ گرا... ساتھ ہی اسپیکٹر جمشید نے اس پر چھلانگ لگائی... ایک منٹ پوری طاقت سے اس کی کن پٹی پر دیا اور پستول پر ہاتھ ڈال دیا... دوسرے ہی لمحے وہ پستول ہاتھ میں لیے سیدھے کھڑے ہو چکے تھے:

”بس... اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔“

اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا... نہ ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی... پتا نہیں وہ بچ بچ بے ہوش ہو گیا تھا یا جان بوجھ کر بے ہوش بن رہا تھا۔

”اس کا کھیل کیا... یہ تو خود ہی ختم ہو گیا۔“ فرزانہ بولی۔ اس کی کمر پر ٹکرائی نے ماری تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک اٹھے۔

اب جوانوں نے ملک دلیر کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے خون کی ایک لکیر نکل رہی تھی۔

”اوہ... اس نے شاید زہر کھا لیا... زہر کا کوئی کپسول یا سوئی اس کے پاس رہی ہوگی۔“ اسپیکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے جھک کر دیکھا تو ملک دلیر کے جسم میں تھر تھری دوڑ چکی تھی... دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا... اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی کا مگنیز غائب تھا:

”اوہ... اس نے ہیرا لٹکا ہے... یا پھر گلیے کی جگہ زہر بھرا ہوا تھا۔“

”اور ابھی اس کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کرنا ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”ایس پی منظور صاحب... آپ اور انسپٹر سجاد صاحب اپنی ڈیوٹی سنبھالیں... سب انسپٹر صاحب کو بھی ڈیوٹی پر بحال رکھیں، کیونکہ انھوں نے بھی آخری وقت میں مجرم کا ایک غلط حکم ماننے سے انکار کیا تھا۔“

”جی بہتر۔“

”ڈاکٹر بھائی وغیرہ سے ہم خود ہیٹ لیں گے... آپ یہاں ملک دلمیر کے چچوں کو گرفتار کر لیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ واپس دارالحکومت جا رہے تھے... رات بھیک چلی تھی... چاند کی بھی آخری تاریخیں تھیں... ایسے میں فاروق نے کہا:

”لیکن ابا جان... مجرم نے صدر صاحب پر قاتلانہ حملہ کیوں کر لیا؟“

”خود اقتدار پر قبضہ جانے کے لیے... کیونکہ صدر کے بعد ملک بھر میں اس کی حیثیت زیادہ تھی... لوگ اسے ہی صدر کی کرسی پر بٹھاتے... یا پھر اس نے یہ کام کسی بڑی طاقت کے اشارے پر کیا ہوگا، لیکن غرض اس طرح بھی وہی رہے گی، بڑی طاقتیں اسی طرح حکومتیں بدل ڈالتی ہیں اور اپنی مرضی کے حکمران اُد پر لے آتی ہیں۔“

”اُف تو بہ... اللہ بچائے ان بڑی طاقتوں کے چنگل سے... اسی لیے تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں... غیر مسلم تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔“ محمود بولا۔

”اور مجھے خیال ستار ہا ہے امی جان کا... اکیلی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ فرزانہ بولی۔

”فکر نہ کرو... ہم جو جا رہے ہیں، ان کے ساتھ پریشان ہونے کے لیے۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا اور انسپٹر جشیہ مسکرانے لگے۔ فرزانہ اسے گھور کر رہ گئی۔ محمود کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے اس نے فاروق کا جملہ سنا ہی نہ ہو، وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو چکا تھا۔